عرفان جاوید

کافی ہاؤس

(افسانے/کہانیاں)

(افسانے رکہانیاں)

عرفان جاوید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Irfan Javid
Coffee House / Irfan Javid.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2011.
216pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

2011
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2414-4
ISBN-13: 978-969-35-2414-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

اپنے دادا جان

اور

نانا جی کے نام

جو آج بھی میرے اندر زندہ ہیں

آنانکہ محیط فضل و آداب شدند
درجمع علوم شمع اصحاب شدند
رہ زین شب تاریک نبردند بروز
گفتند فسانہ ای و درخواب شدند

(عُمر خیام نیشاپوری)

وہ جو کہ محیط فضل و آداب ہوئے
پڑھ پڑھ کے علوم شمع احباب ہوئے
تاریکی شب سے وہ نہ نکلے باہر
اِک قِصّہ سا کہہ کر محوِ صد خواب ہوئے

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شُہُود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

(اسداللہ خاں غالب)

فہرست

سمجھوتا

جامی صاحب کی شادی کی یہ سالگرہ بہت ہی بے مزہ گزری۔

اُس صبح جب وہ نیم خوابی کی سی کیفیت سے اُٹھے اور باہر برآمدے سے اخبار لینے کے لیے تھکے تھکے انداز میں خواب گاہ سے نکل کر گھر کے مرکزی کمرے میں آئے تو اُنھیں وہ کمرا اجنبی سا محسوس ہوا۔ دراصل پچھلی رات کو اُن کے سو جانے کے بعد بیگم جامی نے دبے پاؤں مرکزی کمرے میں جا کر اُسے چھپا کر رکھے آرائشی سامان سے بہت خوب صورتی سے سجا دیا تھا۔ کمرے کے وسط میں کرسٹل نما شیشے کا مصنوعی فانوس لٹک رہا تھا جس کے ساتھ ایک جھالر کی شکل میں چھوٹے چھوٹے گول بلب آویزاں تھے۔ کمرے کے چاروں کونوں میں بہت نازک اور نفیس گل دانوں میں رنگ برنگے جاں افزا پھول کھلے تھے اور سامنے کی دیوار کے عین وسط میں انگریزی میں محبت بھرے کلمات چسپاں تھے۔

اُنھوں نے ان سب چیزوں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ابھی آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ کسی نے پیچھے سے اُن کی کمر کے گرد نرماہٹ سے بازو حمائل کر لیے اور بہت ہی میٹھی اور رومان بھری آواز میں سرگوشی کی۔

''جانو شادی کی چوبیسویں سالگرہ مبارک ہو۔''

''ہیں سارہ آج ہماری شادی کی چوبیسویں سالگرہ ہے۔'' وہ حیرت سے بولے۔

''جانو اوپر دیکھو فانوس کے ساتھ چوبیس بلب اور وہ دیکھو چاروں کونوں میں چوبیس چوبیس پھول اور پیچھے دیکھو۔'' بیگم جامی نے پیچھے سے اُن کے کندھے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہا تو جامی صاحب نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس پر وہ ہنس پڑیں۔

''ارے اِدھر پیچھے نہیں بلکہ زندگی میں پیچھے گزرے خوب صورت چوبیس سالوں کی طرف۔''

اِس پر جامی صاحب بے دلی سے ہلکا سا مسکرائے اور بوجھل قدموں سے آگے چل دیئے۔

بیگم جامی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

جب تک وہ صدر دروازے تک پہنچے تب تک بیگم جامی تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھیں اور دروازے کے سامنے اُن کا رستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔

''تم نے تو بس یہ روگ دل ہی کو لگا لیا ہے۔ پچھلے چھ روز سے کچھ بھی کھا پی نہیں رہے۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزار دیتے ہو۔ کل آدھی رات کو اُٹھ کر باہر برآمدے میں جا کھڑے ہوئے اور سگریٹ سُلگا لی۔ دس برس پہلے یہ مردود سگریٹ چھوڑی تھی۔ اب پھر سے یہ لعنت اپنی جان کو لگا لی ہے۔'' اب تک بیگم جامی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

صبح کی دھوپ نے کمرے کی ہر شئے کو پیلے روغن سے رنگ دیا تھا۔

جامی صاحب نے خاموشی سے لحہ بھر کو بیگم کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر نظریں ہٹا لیں۔ اُن کی آنکھوں تلے نیچے گہرے سیاہ حلقے اُبھر آئے تھے جیسے کسی نے گھونسے دے مارے ہوں۔ پچھلے کئی روز سے شیو نہ کرنے کے باعث داڑھی بھی بڑھ آئی تھی۔

بیگم جامی کو داڑھی اور سر کے بالوں میں سفید بال معمول سے کچھ زیادہ ہی دِکھ رہے تھے۔ چہرے کی جلد بھی تجلجی معلوم ہوتی تھی۔ ایسے میں صبح کو اُٹھنے کے بعد منہ نہ دھونے کے باعث چہرے پر چکناہٹ کی تہہ سی بچھی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گوشوں میں گدیں جمی ہوئی تھیں۔

بیگم جامی اُنہیں ہمدردی سے کچھ دیر دیکھتی رہیں پھر بول اُٹھیں۔

''یوں لگتا ہے کہ تم پچھلے چھ روز میں اَڑتالیس کے بجائے ساٹھ برس کے ہو گئے ہو۔ اگر تم نے یہی حالت بنائے رکھی تو مجھے کون حوصلہ دے گا۔ ٹھیک ہے تم سے غلطی ہو گئی ہے مگر غلطی تو

کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور پھر آئی کو کون ٹال سکتا ہے۔"

جامی صاحب خالی نظروں سے بیگم کو دیکھتے رہے۔ بیگم تھک ہار کر سامنے سے ہٹ گئیں اور قریبی صوفے پر دھم سے جا گریں اور سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

جامی صاحب کی اندھی نظریں اُسی متعین مقام پر مرکوز رہیں پھر جیسے وہ چونک گئے اور بے خیالی میں واپس خواب گاہ کی جانب چل دیئے۔ آدھے رستے پر پہنچ کر وہ پھر سے چونک گئے اور مڑ کر دوبارہ صدر دروازے کی جانب چل پڑے۔

باہر برآمدہ عبور کر کے انھوں نے گیٹ میں اُڑسے اخبار کو نکالا، بغل میں دبایا اور برآمدے میں پڑی بید کی کرسی پر آہستگی سے بیٹھ گئے اور اخبار کھول کر گود میں پھیلا لیا۔ وہ تھوڑی دیر انہماک سے سرخیوں اور تصویروں کو دیکھتے رہے۔ اُن کی نظریں لفظوں کو ٹٹولتی رہیں لیکن اُن سے معانی کشید کرنے میں ناکام رہیں۔

آخر وہ جھنجلا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اخبار کو خلافِ عادت بغیر تہہ کیے اُسی طرح کھلا بکھرا چھوڑ کر گھر کے اندر آ گئے۔ مرکزی کمرے میں وہ میز کے کونے سے ٹکرا کر لڑکھڑائے مگر سنبھل گئے اور پھر گویا عملِ تنویم کے زیرِ اثر خواب گاہ سے ملحق غسل خانے میں جا گھسے۔

اندر سے کچھ دیر تو دانتوں پر برش رگڑے جانے کی اور نلکا چلنے کی آواز آتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔

کموڈ پر بیٹھ کر اُنہیں یاد آیا کہ وہ مدتوں بعد بغیر اخبار کے اُس پر بیٹھے ہیں۔

وہ جیسے تیسے شیو کیے بغیر چہرے کو تولیے سے پونچھتے باہر نکلے تو لیے کا گولا سا بنا کر قریبی کرسی پر پھینکا اور سامنے پڑا ٹی وی چلا کر قریبی کرسی پر دراز ہو گئے۔

انھوں نے ریموٹ کنٹرول سے کھیلنا شروع کر دیا۔ کبھی ایک چینل تو کبھی دوسرا، کبھی ڈرامے کا، کبھی خبروں کا اور کبھی کھیلوں کا۔

سامنے چینل پر ایک مرد ہاتھ نچا نچا کر زیتون کے تیل میں مچھلی بنانے کا طریقہ سکھا رہا تھا۔

اُن کو جیسے کچھ یاد سا آ گیا۔

"سارہ۔" اُنھوں نے آواز دی۔

''سارہ۔ چائے لے آنا۔'' انھوں نے دوبارہ آواز دی۔

تھوڑی دیر بعد جب بیگم جامی آملیٹ انڈے، آلو کے بھرتے، دہی، شہد، مکھن اور تازہ سینکے گئے توسوں کا ناشتہ بھاپ اُڑاتی چائے کے ساتھ کمرے میں لے کر آئیں تو جامی صاحب کارٹون چینل کو انہماک سے گھورتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

ٹرے کی آواز سے وہ گویا نیند سے جاگ گئے۔

''جانو کچھ تو کھالو۔ خدا کے لیے۔ تم تو بالکل ہی بچے بن گئے ہو۔ مرد ہو۔ پختہ عمر ہو۔ تم اتنے بزدل ہو سکتے ہو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ مجھے تو دعویٰ تھا کہ میں تمھیں تم سے زیادہ جانتی ہوں مگر یہاں تو تم نے مجھے اپنی بزدلی سے بالکل ہی حیران کر دیا ہے۔''

جامی صاحب نے بیگم کی بات سنی اَن سنی کر دی اور پلیٹوں کو دور کھسکا کر چائے پینے لگے۔

گہرے رنگ کے بھاری پردوں کی وجہ سے خواب گاہ میں سورج کی روشنی شام کے سائے کی طرح آتی تھی۔ گو کہ اے سی بند کر دیا گیا تھا مگر اُس کی ٹھنڈک کمرے کے دبیز قالین، وزنی پردوں اور بستر کی چادر کی شکنوں میں ہنوز رَچی بسی تھی۔

وہ خواب گاہ جو عموماً صبح کو آفٹر شیو لوشن اور قیمتی پرفیوم کی خوشبو سے مہکا کرتی تھی اس وقت مردہ رات کی باس میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اب اس باس میں تلے انڈے اور گرم چائے کی مہک گھل مل رہی تھی۔

چائے پینے کے بعد جامی صاحب نے ٹی وی بند کر دیا اور آنکھیں موند کر کرسی کی پشت پر سر کی ٹیک لگا دی۔ پھر کپکپاتے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے بیگم کا ہاتھ تھام لیا۔

خاموشی کی ہتھوڑی کمرے کے چوبی ماحول میں تناؤ کے کیل ٹھونکنے لگی۔

''سارہ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

پھر خاموشی ہوگئی۔

''مجھے اماں بہت یاد آ رہی ہیں۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔

''میرا دل کرتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے سو جاؤں۔''

پھر خاموشی سارے میں پھیل گئی۔

''ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ جان بوجھ کر آنکھیں موند لیتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سب خواب ہو مگر صبح ہو جاتی ہے اور یہ کوئی خواب نہیں نکلتا۔''

پھر خاموشی کمرے میں لرزنے لگی۔

''ٹھنڈ بہت لگتی ہے، جی کرتا ہے کہ گرم لحاف میں دُبک کر تکیے میں منہ دے لوں اور خوب روؤں۔''

اعصاب شکن خاموشی میں جامی صاحب کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

''جی کرتا ہے۔ جی کرتا ہے کہ پھر سے بچہ بن جاؤں اور اماں کی گود میں سر رکھ کر سو جاؤں۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔ دم درود کرتی رہیں اور میں کڑمڑا کر اُن سے لپٹ کر سو جاؤں۔ وہ مجھے اپنی چادر میں لے لیں اور میں دنیا کی نظروں سے دور پھر سے اپنی اماں کی گود میں چھپ جاؤں۔''

دو آنسو جامی صاحب کی بند آنکھوں کے گوشوں سے نکلے اور چہرے پر لکیریں بناتے ٹھوڑی سے ٹپک پڑے۔

ہچکیوں کی آواز سن کر اُنھوں نے آنکھیں کھولیں تو بیگم جامی منہ میں دوپٹہ ٹھونسے رو رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور پورا بدن ہچکیوں کی وجہ سے لرز رہا تھا۔

جامی صاحب نے بیگم کو سینے سے لگا لیا اور رونے لگے۔ تھوڑی دیر میں جب جذبات کچھ تھمے تو بیگم جامی مصنوعی خفگی سے بولیں۔

''جانو تم نے آج کے دن کا آغاز بہت اچھے تحفے سے کیا ہے۔ ان چوبیس سالگرہوں کا یہ بہترین تحفہ تھا۔''

جامی صاحب خفیف ہو کر بولے۔

''معاف کرنا مجھے یوں تمھیں پریشان نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''نہیں یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ وہ جو تم کہتے ہو کہ ہم روح کے سفر میں بدن کے شریک ہیں۔ مگر ہاتھ میرا تھام رکھا ہے اور یاد اماں کو کر رہے تھے۔'' بیگم جامی کی خفگی برقرار تھی۔

جامی صاحب زچ سے ہوکر بولے۔

''سارہ۔خدا کے لیے۔بس کرو یہ ساس بہو کے مسئلے اور اب تو اماں کو فوت ہوئے بھی دس برس ہونے کو ہیں۔''

بیگم جامی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''مگر اُن کے ساتھ چودہ برس کی عمر قید بھی تو کاٹی ہے۔''

قبل اس کے کہ جامی صاحب غصّے میں پھٹ پڑتے،بیگم نے اُن کے مزاج کا اندازہ لگالیا اور مصالحانہ لہجے میں بولیں۔

''چلو چھوڑو معاف کردو۔''

اس پر جامی صاحب نے خاموشی کی چادر اوڑھ لی۔

بیگم جامی نے بہت لاڈ سے اُن کی طرف دیکھا اور بولیں۔

''اچھا یہ بتاؤ آج کا دن بہت خاص ہے۔ہم رات کا کھانا گھر میں موم بتیوں کی روشنی میں کھائیں گے یا پھر کسی اچھے سے ریستوران میں چلیں اور ہاں...... میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر وہ خواب گاہ سے باہر چلی گئیں۔

اس دوران ناشتے پر چیونٹیاں چڑھ آئی تھیں۔

چیونٹیوں کو دیکھ کر جامی صاحب سوچنے لگے کہ مُردوں پر بھی اسی طرح کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں چڑھ آتی ہوں گی اور کبھی اُن کے ناک،کان اور کبھی کھلے منہ سے رستہ بناتی ہوں گی۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ بیگم اندر آئیں۔انھوں نے دونوں بازو کمر کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔وہ چہکیں۔

''میری مٹھی میں بند ہے کیا؟''

اس پر جامی صاحب خاموش رہے۔

بیگم جامی نے ایک ہتھیلی آگے کی تو اُس میں گھڑی تھی۔

''دیکھو اِس کے ڈائل میں چوبیس پتھر لگوائے ہیں۔''

جامی صاحب نے بے دلی سے ڈائل کو دیکھا اور مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے

ہوئے بولے۔

"سارہ بہت اچھا تحفہ ہے۔"

اس پر بیگم نے دوسری ہتھیلی آگے کی تو اس میں ایک خوب صورت بریسلیٹ تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم بہت پریشان ہو اسی لیے تمھاری طرف سے بھی اپنے لیے تحفہ خرید لائی ہوں۔"

"بہت اچھا ہے۔" جامی صاحب نے سادہ لہجے میں کہا۔

"اور ہاں کھانے والی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ بتاؤ کیا بناؤں تمھارے لیے۔ آنجناب کے موڈ آج اچھے نہیں اس لیے باہر جانے کا فائدہ نہیں۔ کیوں نہ تمھاری کوئی پسندیدہ ڈش بناؤں یا پھر ایک سرپرائز دوں۔"

جامی صاحب ہکلائے۔

"سارہ شکر ہے کہ ہمارے بچے نہیں۔ شروع شروع میں محرومی کا احساس بہت تھا مگر اب سمجھ میں آیا ہے کہ رب کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ میرے بغیر وہ کہاں دھکے کھاتے اور پھر جب سب اُن کو مجرم کی اولاد کہتے تو وہ احساسِ محرومی کا شکار ہو جاتے۔" وہ بڑبڑائے۔

بیگم جامی جھنجلا اُٹھیں۔

"بس جانو بس۔ اور نہیں۔ تم تو پاگل ہو گئے ہو۔ بے وجہ خوف زدہ ہو گئے ہو ہم دونوں کی بسائی اس چھوٹی سی جنت کو خراب کر رہے ہو۔ باہر کی ظالم دنیا میں عافیت کا ایک جزیرہ ہے ہمارا گھر۔ تنکا تنکا جوڑ کر گھونسلا بنایا ہے۔ ٹھیک ہے اولاد نہیں ہے پر خواہش تو باقی ہے۔"

اب بیگم جامی کی گفتگو بے ربط ہو رہی تھی۔

"چلو بس کرو۔" یہ کہہ کر جامی صاحب نے بات ختم کر دی۔

پچھلے چھ روز میں یہ پہلا موقع تھا کہ جامی صاحب متواتر اتنی دیر تک بولے تھے وہ بھی شادی کی سالگرہ کی وجہ سے۔ وگرنہ انھوں نے تو چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا۔ بس ہر وقت نڈھال نڈھال اور چپ چپ رہتے۔

اپنی فرم تھی، سو اگر چند روز نہ بھی گئے تو پیچھے منیجر اور ملازم کام سنبھال رہے تھے۔

پچھلے چند روز سے بیگم نے دل جوئی کی بھی بہت کوشش کی تھی۔مگر بہت کچھ اُن کے اپنے بس میں نہ تھا۔وہ کچھ دیر کے لیے ہنسی کھیل کی باتیں کر لیتے اور مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجا لیتے مگر اندر سے بڑی طرح گھائل تھے۔

بیگم جامی بھی سب سمجھتی تھیں مگر وہ اپنے شوہر کا دل بڑھانے کے لیے دل جوئی کی باتیں کرتی تھیں۔پریشان تو تھیں مگر زیادہ نہیں۔

وکیل نے اُنھیں بھرپور تسلی دی تھی۔

بیگم صاحبہ کو وکیل پر بہت اعتماد تھا۔وہ عدالت سے باہر سمجھوتے کی بھرپور کوشش میں تھا۔

''چپڑاسی تک کو صاحب کہہ کر بلایا ہے۔اور زندگی بھر کام اس طرح سے لیا ہے کہ جیسے درخواست کی جاتی ہے۔'' اِدھر وہ معصومیت سے سوچتے۔

پھر دوبارہ سوچتے ''اس معاملے میں میری کون سی بدنیتی تھی۔بس اُس وقت انتظام نہ تھا۔سوچا تھا کہ بروقت لوٹا دوں گا...... پر اُس سے پہلے ہی معاملات خراب ہو گئے۔''

اُس روز افسردگی شام کے سایوں میں گھل کر اُتر رہی تھی۔

شام کے کسی لمحے بیگم جامی کمرے میں آئیں تو چونک گئیں۔

''جانُو تم اندھیرے میں کیا سادھو بن کر بیٹھے ہو۔چلو اُٹھو۔شاباش۔مرکزی کمرے میں تو آ جاؤ۔ارے بھئی ہسپتالوں میں تو مریضوں کو بھی کروٹ بدلوائی جاتی ہے کہ جسم کا کوئی حصہ گل نہ جائے اور تم صبح سے ایک ہی حالت میں بیٹھے ہو۔''

اتنا کہہ کر بیگم جامی نے کمرے کا بلب جلا دیا۔

مانوس مہربان اندھیرے کی جگہ یرقان زدہ روشنی نے لے لی۔

صبح سے ایک ہی کرسی پر بیٹھے تھے۔سو جب بیگم کے اصرار پر اُٹھے تو جسم کا زیریں حصہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔اور اُٹھنے پر گھٹنوں میں سے کنکنانے کی آوازیں آئیں۔

مرکزی کمرے میں مصنوعی فانوس، رنگ برنگے پھول اور دیواروں پر چسپاں جملے اُسی طرح تھے اور کھانے کی میز پر دو بڑی خوشبودار موم بتیاں روشن تھیں۔کمرا اَب پھولوں کی اور موم بتیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

ساتھ میں باورچی خانے میں پکتے پکوانوں کے مصالحہ جات اور دَم پر رکھے پلاؤ کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

''جانُو اب اچھے بچوں کی طرح یہاں بیٹھ جاؤ اور کھانے کا انتظار کرو۔''

جامی صاحب کا جی چاہا کہ بیگم سے کہہ دیں کہ اُن کا کھانے کا دل نہیں مگر پھر ایسا کہنے سے اجتناب کیا۔

تھوڑی دیر میں کھانا لگنے لگا۔

گرما گرم مٹن قورمے کی قاب سب سے پہلے آئی۔ ساتھ میں مٹر قیمہ تھا۔ بینگن کے بھرتے کے ساتھ پودینے کی دہی میں بنی چٹنی آئی اور دھواں دیتا پلاؤ اُس کے بعد آیا۔ سب سے آخر میں دہی اور کالی مرچ میں بنا خاص مُرغِ مُسلّم آیا۔

بیگم جامی جب آ کر بیٹھیں تو بولیں۔

''جانُو یہ سب آج میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور یہ مرغ مسلم تو میں نے خاص اس موقع کے لیے سیکھا تھا۔ اب تمھیں کوئی نخرے وخرے نہیں کرنے۔''

جامی صاحب نے چہرے پر بمشکل مسکراہٹ سجائی اور چاول پلیٹ میں ڈالنے لگے۔

ابھی کھانا شروع ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ جیسے بیگم جامی کو کچھ یاد سا آ گیا۔

انھوں نے خانساماں کو آواز دی کہ وہ گرم گرم چپاتیاں کھانے کے ساتھ لاتا جائے۔ اس پر جامی صاحب نے کمزوری آواز میں بیگم کے کان میں سرگوشی کی کہ اس کی ضرورت نہیں اور وہاں سے اُٹھ گئے۔

انھوں نے چاولوں کے بمشکل چار پانچ ہی لقمے لیے تھے۔

یہ اُسی آخری رات کی بات ہے۔

اور یہ اُس رات کی بات ہے جب جامی صاحب خواب گاہ میں لیٹے تھے اور اُن کے بازو پر اُن کی بیگم کا سر تھا اور دونوں کا رُخ چھت کی جانب تھا اور وہ دونوں یوں باتیں کرتے تھے جیسے خودکلامی کرتے ہوں اور وہ بھی سرگوشی میں۔

''سارہ تمھیں یاد ہے کہ ہمیں بچوں کا کتنا شوق تھا۔''

''ہاں۔''

''مجھے ایک بیٹا چاہیے تھا اور ایک بیٹی۔''

بیگم جامی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''جب کہ تمھیں دو بیٹوں کا شوق تھا۔''

''آں۔''

''اور میں کہتا تھا کہ یہ بیٹیاں ہی ہوتی ہیں جو باپوں کو بڑھاپے میں سنبھالتی ہیں۔''

''ہوں۔''

''اور تم کہتی تھیں کہ یہ بیٹے ہی ہوتے ہیں جو باپوں کو آخری غسل دیتے ہیں۔ میرا تو کوئی بیٹا بھی نہیں۔''

خاموشی۔

''سارہ یاد ہے کہ ہم دونوں نے اس مکان کو گھر بنانے کے لیے کتنے جتن کیے۔ میں جب بھی شہر سے یا ملک سے باہر گیا کوئی نہ کوئی سجاوٹ کی چیز ضرور لایا۔''

''ہاں۔''

''تم نے بھی اس گھر کو تنکا تنکا، اینٹ اینٹ بنایا ہے۔ جب کبھی میں باہر کے حالات دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ گھر ایک جہاز ہو جو خون کے سمندر میں رواں دواں ہو۔ کیا تمھیں بھی یہاں ایسے ہی تحفظ کا احساس ہوتا ہے؟''

''ہوں۔''

''تمھیں یاد ہے کہ جب یہ گھر مکمل ہوا تھا تو اماں گزر چکی تھیں۔ میری خواہش تھی کہ انھیں یہاں اپنے ساتھ رکھتا اور ہم دونوں اُن کی اتنی خدمت کرتے کہ وہ اپنی بیوگی کے سارے غم بھول جاتیں۔''

''ہاں۔''

''سارہ یہ تم ہی ہو جس نے میرا اتنا خیال رکھا۔ مجھے بچوں کی طرح پالا۔ کبھی میرا وزن نہیں بڑھنے دیا کہ یہ اچھا نہیں ہوتا۔ چالیس برس کی عمر کے بعد چینی بھی کم کروا دی کہ شوگر نہ ہو جائے۔ بہت برس پہلے سگریٹ بھی چھڑوا دی تھی۔ وہ تو میں نے آخری پیشی کے بعد پینی شروع

کی ہے۔کل تک پینے کی اجازت ہے؟''

''ہاں۔''

''سارہ تم مجھے آج بھی اتنا ہی پیار کرتی ہو جتنا شروع میں کرتی تھی؟''

''زیادہ۔''

''عادت ہوگئی ہوگی۔''

''نہیں یہ خالص پیار ہے۔ پہلے صرف شدت تھی اب گہرائی بھی ہے۔''

اس کے بعد خاموشی کا ایک طویل وقفہ آ گیا۔

''سارہ میرے قریب آ جاؤ۔''

کمرے میں سرسراہٹ کی آواز گونجی۔

''تم نے میرے بازو پر سر رکھا ہوا ہے۔ میرے بغل سے بُو تو نہیں آ رہی۔ تمھیں پریشان تو نہیں کر رہی۔''

''نہیں۔''

''اپنی چادر ٹھیک کرلو۔ رات کو کہیں اے سی کی ہوا تمھیں بیمار نہ کر دے۔''

''سارہ تمھیں پتا ہے کہ...... خیر تمھیں کیا پتا ہوگا کہ میں نے پہلے کبھی بتایا ہی نہیں کہ مجھے بچپن میں فلم ایکٹر بننے کا شوق تھا۔کیا میں نے پہلے کبھی بتایا؟''

''نہیں۔''

''اور کیا میں نے یہ کبھی بتایا کہ ایک مرتبہ میں نے گھر سے بھاگ کر فلمی اسٹوڈیو جانے کا ارادہ باندھ لیا تھا لیکن آخری وقت میں ہمت جواب دے گئی تھی۔''

''نہیں۔''

''میرے بچپن کی تصویروں میں بالوں کی ایک لٹ میرے ماتھے پر گر رہی ہوتی ہے۔ یہ دراصل ایک فلمی پوز تھا۔''

''اچھا۔''

اس کے بعد گھپ اندھیرے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔صرف ایک کونے میں مچھر

مار مشین کا جگنو ٹمٹمار ہا تھا۔

''سارہ آج میں تمھارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ سن سکتی ہو؟''

''ارے سارہ سن رہی ہو یا سو گئی ہو؟''

''سن رہی ہوں۔''

''لیکن پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔''

''جاؤ تم تو بالکل لڑکوں کی طرح ضد کر رہے ہو۔''

''لیکن تم پہلے ہاں کرو۔''

''ٹھیک ہے۔''

''وعدہ؟''

''ہاں۔''

''سارہ مجھے تمھاری سہیلی مریم اچھی لگتی تھی۔ میں دل ہی دل میں اُسے پسند کرنے لگا تھا۔ چند ایک بار مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُس نے بھی میری حوصلہ افزائی کی ہو۔ پر آخری وقت میں کوئی نادیدہ قوت مجھے پیش قدمی سے روک دیتی تھی...... بہرحال میں نے یہ جذبہ تم سے چھپائے رکھا۔''

خاموشی۔

''سارہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔''

خاموشی۔

''سارہ میں جانتا ہوں کہ یہ بھی بے وفائی کی ایک قسم ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی سچے دل سے اعتراف کر کے معافی مانگی جائے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ تم بھی مجھے معاف کر دو۔''

سسکیاں اپنے نوکیلے ناخنوں سے خاموشی کے چہرے پر خراشیں ڈالنے لگیں۔

''سارہ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔''

''اچھا۔''

''میرے اور قریب آ جاؤ۔''

رات کے پچھلے پہر بیگم جامی کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ جامی صاحب کھڑکی سے

پردہ ہٹا کر کمرے سے باہر گھپ اندھیرے میں گھور رہے ہیں۔

پھر اُن کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز عدالت نے ریکارڈ پر موجود ثبوتوں اور گواہوں کے بیانات کی روشنی میں سرمد جامی ولد جان محمد جامی کو بینک میں پراپرٹی کے تحریف شدہ کاغذات جمع کروا کر اپنی فرم کے لیے اضافی قرضہ لینے کا جرم ثابت ہو جانے پر قید اور جرمانے کی سزا سُنا دی۔

فیصلہ سنتے ہی بیگم سارہ جامی پر غشی کے دورے پڑنا شروع ہو گئے۔

سرمد جامی کا رنگ پیلا پڑ گیا، کپکپاہٹ کے باعث اُن کے لیے کھڑا رہنا ممکن نہ رہا اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں نیم دراز ہو گئے۔

بینک کا منیجر اپنے وکیل سے بولا ''اگر اِسے مثال نہ بناتے تو لوگ سارا بینک ہی لوٹ لے جاتے۔''

بیگم سارہ جامی کو اُن کی بہن نے سنبھالا۔

سرمد جامی کو ہتھکڑیاں لگا کر قیدیوں والی وین میں بٹھایا گیا۔

وین دھواں چھوڑتی اور گرد اُڑاتی چلچلاتی دھوپ میں جیل کی جانب روانہ ہو گئی۔

جیل میں وہاں کے عملے نے قیدی کو وین میں سے نکالا۔

اُس کا کاغذات میں اندراج کیا گیا۔

اُسے جیل کا لباس دیا گیا۔

نمبر الاٹ کیا گیا۔

ضروری کارروائی میں سہ پہر ہو چلی تھی۔

اس ساری کارروائی کے بعد مجرم کو اُس کی بیرک میں پہنچا دیا گیا۔

اُس بیرک میں سرمد جامی کے علاوہ تین قیدی اور تھے۔

ایک بزرگ قیدی تھا اور دو جوان۔

بزرگ قیدی کی ٹھوڑی پر خشخشی داڑھی تھی۔ نقوش بھدے تھے لیکن چہرے پر ایک مہربان اُنسیت تھی۔ باقی دو جوان قیدی عام چہروں اور جثوں کے مالک تھے۔

سب نے انھیں اس طرح دیکھا جس طرح چڑیا گھر میں نئے لائے جانے والے جانور کو پرانے جانور دیکھتے ہوں۔

جامی صاحب کچھ دیر تو نیم بے ہوشی کے عالم میں کونے میں پڑے رہے۔ اُن سے آنکھیں بھی ٹھیک طرح سے کھل نہیں پا رہی تھیں۔ دو تین کیڑے مکوڑے اُن کو اپنے جسم پر رینگتے محسوس ہوئے مگر اُن میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ وہ اُنھیں ہاتھ کی تالی سے مار دیتے۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر بزرگ قیدی ساتھ والے جوان قیدی سے بولا۔

''باؤ پڑھا لکھا لگتا ہے۔''

جوان قیدی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اسی لیے بزدل بھی ڈاھڈا ہے۔''

پھر توقف کر کے بولا۔

''شروع میں سارے ہی ایسے ہوتے ہیں۔''

جامی صاحب گٹھڑی بنے پڑے رہے۔

تھکاوٹ، نقاہت اور مسلسل سرسامی کیفیت کے ایک مسلسل دورے کے بعد چھنچھناہٹ کی آواز سنتے ہی جامی صاحب نے بمشکل ایک آنکھ کھولی، پھر دوسری کھولی۔

سامنے جیل کا کھانا رکھ دیا گیا تھا۔

ایک پلیٹ دال اور چپاتیاں۔

باہر شام کے ٹھنڈے سایوں میں رات کی سیاہی گھل رہی تھی۔ جامی صاحب نے دائیں بائیں، ارد گرد دیکھا۔ ٹٹول کر اپنے جسم کے اعضا چھوئے اور دیوار کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اُن کا سر اپنے ہی بوجھ سے دیوار سے ٹک گیا۔

اُنہیں اپنا خون گردش کرتا اور رگوں میں دھڑکتا ہوا سنائی دیا۔

باہر گرمیوں کی شام کی ٹھنڈی ہوا جامی صاحب کے جسم کے ہر ہر روئیں پر اپنی نرم انگلیاں پھیرتی چلی گئی۔

جامی صاحب نے نیم مُندی آنکھیں مزید کھولیں۔

آسمان کے سیاہ لانبے بالوں پر ٹنگا نیا چاند اور ستارے چاندی ایسی چمکتی روشنی زمین کی جانب پھینک رہے تھے۔

جامی صاحب کو ہوا میں تازگی کا احساس ہوا۔

انھوں نے لمبی سانس لے کر اپنے اے سی زدہ پھیپھڑے تازہ ہوا سے بھر لیے۔

بزرگ قیدی اُنھی کو دیکھ رہا تھا' بولا۔

''باؤ مفت ملتی ہے۔''

انھوں نے استفہامیہ انداز میں اُس کی جانب دیکھا۔

وہ بولا۔''باؤ' یہاں تازہ ہوا مفت ملتی ہے جتنی چاہو لُوٹ لو۔''

جامی صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

تازہ ہوا سے تازگی اُن کے خون کے تمام خُلیے سیراب کر چکی تھی۔

سو انھوں نے بیٹھے بیٹھے ہی ایک انگڑائی لی اور ایک نومولود بچے کی طرح پوری آنکھیں کھول کر آس پاس کا جائزہ لیا۔

''باؤ پہلی بار آئے ہو؟'' بزرگ قیدی نے پوچھا۔

انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اسی لیے اتنے ڈرے ہوئے لگتے ہو۔ سڑک پار کرتے پلّے کی طرح۔ چلو عادت ہو جائے گی۔''

جامی صاحب کے ماتھے پر تیوریوں کی لہریں موجزن ہوئیں۔ پھر سطح پر سکون ہو گئی۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ کہیں کہیں سے قیدیوں کے بولنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔

بزرگ قیدی پھر ہنسا اور بولا۔

''یہ اپنا ہوسٹل ہے۔ ہم یہاں کا سب سے پرانا اسٹوڈنٹ ہے۔''

جامی صاحب کو بزرگ قیدی میں اپنائیت سی محسوس ہوئی۔

ہوا میں لکڑی یا بالن جلنے کی بو پھیل رہی تھی۔ جیل کی دیوار کے پرے شاید کوئی غریب بستی تھی۔ ہوا اب اُدھر سے گوبر اور بالن کی بو اور دھواں لا رہی تھی۔ ساتھ میں کسی پکوان کی مہک تھی۔

بزرگ قیدی پھر بولا۔

''باؤ کھانا کھالے۔ یہاں کوئی بے بے نہیں جو کھانا کھلائے گی۔ خود ہی کھانا ہوگا اور یہی کھانا ہوگا۔''

کھانے کے لفظ سے جامی صاحب کو یاد آیا کہ انھوں نے بہت دن سے کھانا نہیں کھایا۔

انھوں نے سامنے دیکھا۔

ایک پلیٹ میں دال پر سبز مرچ تیر رہی تھی۔ ساتھ میں کالے داغوں والی روٹیاں پڑی تھیں۔

اُن کو پیٹ کے زیریں حصے سے غبار سا آنتوں میں سے اُٹھتا محسوس ہوا جیسے خالی کنویں سے ہوا کا اوپر کو اخراج سا ہوتا ہو۔ پھر آنتیں آپس میں ٹکراتی ہوئی اور سکڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

کہیں دور پکتے پکوان کی مہک اُن کی نتھنوں میں دَر آئی۔

جامی صاحب کو شدید بھوک کا ایک دورہ سا پڑا۔

''کھالے باؤ کھالے۔'' بزرگ قیدی بولا۔

روٹی کا آخری نوالہ دال کی پلیٹ میں پھیر کر اُس کا لقمہ بنا کر جامی صاحب نے خوب چبایا، اُسے دانتوں سے نرم کیا اور نگل کر زوردار ڈکار لیا۔ پھر عادتاً سوری کہا اور خفت سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن پھر آسودہ ہو کر پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

پھر وہ خمار آلود لہجے میں بڑبڑائے۔ ''غلطی تو ہر کسی سے ہوتی ہے۔ کیا ہوا جو مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

رات گئے جب جامی صاحب سب قیدیوں سمیت جھینگروں، مینڈکوں اور مکوڑوں کی آوازوں میں گہری نیند سو رہے تھے تو چار آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔

بزرگ قیدی نے کچھ سوچتے ہوئے ساتھ والے شاگرد جوان قیدی سے کہا۔

''پُتر ہونی سے کہیں زیادہ ہونی کا خوف بندے کو مار دیتا ہے۔ بس جند جان کی گڈی کو پیچا تو لگتا ہی رہتا ہے پر اِسے بوکاٹا نہیں ہونا چاہیے۔''

جو جاگے ہیں

اس نے وہ لڑکی ایک رات کے لئے خریدی تھی ۔لڑکی خوبصورت تھی اور بات کرنے کا سلیقہ بھی جانتی تھی ۔دلال نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ناچتی بھی خوب ہے البتہ لڑکی کی زیادہ مشق ٹیپ ریکارڈر پر چلنے والے گانوں پر تھی ۔اعجاز کو اس لڑکی کے ناچ گانے سے کوئی خاص غرض بھی نہ تھی ۔عمدہ ولائیتی شراب کی بوتل بھی کافی مہنگی پڑ رہی تھی ۔اس پر مستزاد ہوٹل کے کمرے کا کرایہ تھا مگر اسے اس خرچے کی کوئی خاص پرواہ نہ تھی ۔وہ تو اس رات کو یادگار بنا دینا چاہتا تھا۔

ابھی دو روز قبل ہی اس نے جب نصیر کے سامنے اپنی پریشانی کا دکھڑا رویا تو نصیر نے یہ حل تجویز کیا تھا۔

"بھلا ایک شریف آدمی کب تک روزانہ اپنی ایک ہی بیوی سے صحبت کر سکتا ہے۔ یکسانیت تو انسان کو اندر سے مار دیتی ہے۔" نصیر نے اعجاز کے کان میں سرگوشی کی۔

"شراب کا تو کبھی کبھار شوق کر لیتا ہوں مگر عورت والی بات سمجھ تو آتی ہے پر دل میں نہیں اترتی ۔" اعجاز نے اپنی ہچکچاہٹ کی توجیہہ پیش کی۔

"پاگلا شروع شروع میں مجھے بھی اس طرح ہچکچاہٹ ہوتی تھی ۔مگر بعد میں سمجھ میں آیا

کہ یہ تو تریاق ہے تریاق۔ پھر میں کون سا تمہیں کہہ رہا ہوں کہ تم باقاعدگی سے اس کام میں پڑ جاؤ۔ مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار جنت کا مزہ لوٹ لیا۔ کچھ حوروں سے جی بہلا لیا۔ پھر لمبا وقفہ "نصیر نے وضاحت کی۔

"یار کہیں عادت ہی نہ پڑ جائے۔ پھر آج کل تو ایسی ایسی بیماریاں آگئی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ جو ہاتھ میں ہے اس سے بھی جاتا رہوں گا۔" اعجاز کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"اول تو تم روزانہ اس خرچہ کے متحمل ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ قدرت کی طرف سے تمہارے اوپر مہربانی ہے۔ تمھاری جیب رکھی ہی اتنی ہے کہ تم یہ عیاشی باقاعدہ نہ کر سکو۔ اسے عیاشی ہی سمجھو، عادت نہ بنالو۔ پھر جہاں تک بیماری کا تعلق ہے اس کے سینکڑوں حل بازار میں دستیاب ہیں۔" نصیر کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

"او کے۔ مگر لڑکی کہاں سے منگواؤں گا۔ میرا تو کسی دلال سے کوئی رابطہ نہیں۔" اعجاز بولا

"یہ تم میرے اوپر چھوڑ دو۔ ایسا اعلیٰ دانہ منگوا کہ دوں گا کہ جی خوش ہو جائے گا۔ لڑکی کالج تک پڑھی ہوئی ہے۔ پیشہ ور نہیں بھی کبھار ضرورتاً کرتی ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ بھی ہے۔ اور شکل تو ایسی ہے کہ اگر سڑک پر کھڑی ہو جائے تو درجنوں گاڑیاں دیکھ کر رک جائیں۔ آخر تجربہ بولتا ہے۔" نصیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور جگہ؟" اعجاز نے استفسار کیا۔

"ہوٹل" نصیر کا جواب تھا۔

" کون سا؟ جہاں پولیس چھاپے کا ڈر نہ ہو" اعجاز نے پوچھا

"چُوری کھاؤ گے" نصیر نے طنز کیا اور ہوٹل کا نام بول دیا۔

"فائنل! ہفتے کی رات۔ پورے نو بجے" اعجاز نے بات مکمل کی۔

"نہیں۔ اُس روز ویک اینڈ ہوتا ہے اور رش بہت ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی ڈیمانڈ زیادہ ہوتی ہے۔ قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔ کوئی اور دن رکھ لو۔" نصیر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"اور ہاں اپنا کوئی یار ساتھ نہ لے آنا۔ آنٹی بہت مائنڈ کرے گی" نصیر نے اضافہ کیا۔

"تم نے مجھے ایسا لچر اور بھوکا ننگا سمجھا ہوا ہے۔ فکر نہ کرو۔" اعجاز نے بات مکمل ہونے

پہ اطمینان کا سانس خارج کرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے کہا۔

نصیر نے اس کی پیٹھ تھپکی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دلال اور لڑکی کا انتظار کرتے اسے کافی دیر ہوگئی تھی۔شراب بھی اسی نے لانا تھی۔اوپر سے کچھ اجنبی سا احساس بھی مضطرب کر رہا تھا۔

پر گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز نے گویا اس کے لئے لوری کا کام دیا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

آنکھ لگے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کمرے کی گھنٹی بجی اور اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

اب وہ لڑکی سامنے بیٹھی تھی۔اس نے اپنے سفید پیروں پر مہندی کے نقش و نگار بنا رکھے تھے جوان پر بہت بھلے لگ رہے تھے۔ایک ٹخنے پر نازک سی پازیب باندھ رکھی تھی۔لڑکی کو میک اپ کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔اس نے دیسی انداز میں چہرے پر رنگ و روغن کی لیپا پوتی کر کے ہونٹوں کو سستی لپ سٹک سے لتھڑا ہوا نہ تھا بلکہ میک اپ اس طرح کر رکھا تھا جس سے چہرے کی رنگت مزید نکھر آئی تھی اور چہرے کے نقوش بہت جاذب نظر ہو گئے تھے۔اُس نے آنکھوں کے گرد ہلکی آئی پنسل کا استعمال کیا تھا جس سے آنکھیں شفاف کٹورے کی مانند بڑی بڑی اور نمایاں ہوگئی تھیں۔رخساروں پر کوئی مصنوعی تل نہ تراشا تھا بلکہ ٹھوڑی کے زیریں حصے پر موجود تل کو اور ابھار کر مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔اعجاز نے ایک بات نوٹ کی کہ لڑکی نے لپ لائنر کا بہت نفیس استعمال کیا تھا۔اس سے ہونٹ اور رسیلے ہو گئے تھے۔

"جی چاہتا ہے ہونٹوں سے سارا شہد چوس لوں" اس نے بیتابی سے سوچا

"مگر ابھی پوری رات پڑی ہے ہلکی آنچ پر رکھتا ہوں" صبر نے بیتابی کو تسلی دی۔

اگر عام حالات میں اعجاز اس لڑکی کو ہوٹل کی لابی میں دیکھتا تو کالج گرل سمجھتا اور قریب آنے کی ہمت بھی نہ کرتا مگر اب حالات کچھ اور تھے۔

"آرام سے بیٹھ جائیے۔گھبرائیں مت اور ہاں یہ جوتی اتار دیجیے"۔اعجاز نے ہمدردی سے کہا۔

لڑکی نے بہت سعادت مندی سے اپنے سینڈل اتار دیئے اور پیروں کو اوپر کر کے بڑی ادا کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔"

"صوفیہ۔"

"بہت خوبصورت نام ہے۔ بالکل آپ کی طرح۔"

"جی شکریہ۔"

"صوفیہ آپ پڑھی لکھی لگتی ہیں۔"

"جی۔"

"یہ جی کے علاوہ آپ کو کچھ اور بولنا نہیں آتا۔"

"جی۔ جی نہیں۔"

"مطلب؟"

"میرا مطلب ہے جی ہاں۔"

"کتنا پڑھی ہیں آپ؟"

"جی ایف اے کیا ہوا ہے۔"

"بہت خوب۔ تو کتنا عرصہ ہو گیا ہے آپ کو اس کام میں؟"

"جی چند ماہ۔"

"یہ سب اسی طرح جھوٹ بولتی ہیں تا کہ ان کی مارکیٹ ویلیو نہ گر جائے۔ کوئی چالیس سالہ خرانٹ عورت بھی لے آؤ تو یہی کہے گی کہ ابھی اس نے کل ہی یہ کام شروع کیا ہے۔" اعجاز کے کانوں میں نصیر کے الفاظ گونجے۔

"تو کیوں شروع کیا آپ نے یہ کام؟"

"بس ویسے ہی۔"

اعجاز اپنے بھولپن پر خود ہی مسکرا دیا۔

"بھلا میں آپ سے یہ سوال کیوں پوچھنے لگا۔ آپ کے سبھی کلائنٹ آپ سے یہ سوال پوچھتے ہوں گے۔"

"جی سبھی پوچھتے ہیں۔ اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔" لڑکی نے صفائی سے سچ بولا۔

"چلیں کوئی اور بات کرتے ہیں۔" اعجاز کچھ سوچتے ہوئے بولا "وہ آدمی جو آپ کو چھوڑ کر گیا تھا بتا رہا تھا کہ آپ بہت اچھا ڈانس کر لیتی ہیں۔"

"جی کر کے دکھاؤں۔" لڑکی نے پیر صوفے سے نیچے کئے۔

"نہیں نہیں۔ میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا" اعجاز نے جلدی سے مدافعانہ رویہ اختیار کیا۔

"نہیں میں ڈانس کے علیحدہ پیسے نہیں لیتی۔ آپ ٹی وی کا گانوں والا چینل لگا لیجئے۔" لڑکی نے ادھر اُدھر گویا کچھ تلاش کرتے ہوئے اسے پیشکش کی۔

"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں تو آپ سے صرف باتیں کروں گا اور پھر پیار کریں گے۔" اعجاز رومانٹک ہو رہا تھا۔

کچھ دیر توقف کرتے ہوئے وہ گویا ہوا۔ "اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"جی"

"آپ ۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ ۔۔۔۔۔ ڈرنک کرتی ہیں۔؟"

"جی کبھی کبھی کرتی ہوں۔ آپ مجھے اچھے آدمی لگے ہیں۔ اس لئے آپ کے ساتھ کر لوں گی۔" لڑکی نے بیباکی سے کہا۔

یہ بات سن کر اعجاز کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر نہیں پی تھی۔ اُس نے بوتل سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔ بوتل میں گہرے رنگ کا محلول بلب کی روشنی میں ہلکی رنگت اختیار کر گیا۔ اعجاز نے فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ساتھ میں پڑی ٹرے پر اوندھے گلاسوں کی جوڑی سیدھی کر کے رکھ دی۔ پھر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

" کم بختوں نے آئس بکس نہیں رکھا۔ ابھی آرڈر کئے دیتا ہوں۔"

چند منٹوں میں ایک باوردی بیرا آئس بکس اور ٹھنڈے پانی کی تین بوتلیں رکھ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے پر تجسس نظروں سے لڑکی کو دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔

لڑکی نے آگے بڑھ کر فریج کا اوپر والا حصہ کھولا اور اس میں سے برف کی ٹکڑیاں نکال کر آئس بکس میں ڈالنے لگی۔ اپنا کام مکمل کر کے وہ اعجاز کے ساتھ بیڈ پر آن بیٹھی۔

"بناؤں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"آپ بنالیتی ہیں؟" اعجاز نے معصومیت سے پوچھا۔

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکرا کر وہسکی کی بوتل کھولنے لگی۔

"پہلا ذرا اسٹرانگ۔" اعجاز نے فرمائش کی۔

"پانی ڈالوں یا صرف برف؟"

"پانی ڈالیں۔ اب وہ جوانی کہاں جب کبھی آن دی راکس پیا کرتے تھے۔" اعجاز نے بے تکلفی سے کہا۔

لڑکی نے بڑی نفاست سے ایک خاص تناسب سے گلاس بھرا اور سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ ایک قطرہ بھی اِدھر اُدھر نہ گرا۔ اس کے بعد دوسرا گلاس بھرنے لگی۔

"اتنا ہلکا؟"

"جی میں شروع میں ہلکا ہی پیتی ہوں۔"

"یعنی کہ جیسے جیسے رات کے اندھیرے گہرے ہوتے ہیں ویسے ویسے سرور بھی بڑھتا ہے۔" اعجاز نے خود دانستگی میں گویا کوئی ادبی بات کہہ دی تھی۔

باہر رات کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

نیچے ہوٹل کی لابی کے ساتھ بونے ریسٹورنٹ میں رش بڑھ رہا تھا۔ اوپر دوسری منزل کے ایک کچھ تاریک کچھ روشن کمرے میں اعجاز ایک ہی گھونٹ میں پہلا پیگ چڑھا گیا تھا۔ اس نے مصنوعی چھت میں لگی لائٹس بجھا دی تھیں۔ کمرے میں فلور لیمپس کی روشنی ماحول کو خواب ناک بنا رہی تھی۔

لڑکی دھیرے دھیرے اپنے گلاس سے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔

جب لڑکی نے اپنا پہلا پیگ ختم کیا تو اعجاز اپنے تیسرے پیگ پر تھا۔

"تیسرا ہے لیکن نشہ ہے کہ چڑھ ہی نہیں رہا۔" اعجاز نے کافی دیر سے کمرے میں قائم سکوت کو توڑا۔

"آپ نے دوپہر کا کھانا دیر سے کھایا ہوگا۔ خالی پیٹ ہوتے تو جلدی چڑھ

جاتی۔" لڑکی نے ماہرانہ تبصرہ کیا۔

"درست کہہ رہی ہو تم ۔میں نے شام کو چائے کے ساتھ کچھ کھا پی لیا تھا" اعجاز کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

پھر سے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"روز پیتے ہیں آپ؟" لڑکی نے خاموشی کی فضا میں سوال داغا۔

"نہیں مہینے دو مہینے بعد۔"

"امپورٹڈ ہی پیتے ہیں؟"

"ہاں۔صرف امپورٹڈ ہی پیتا ہوں۔دیسی تو جگر کو چھلنی کر دیتی ہے۔"

"مگر اب تو دیسی میں بھی اچھے معیار کی آگئی ہیں۔"

"ایک دوست نے پی تھی۔اس کی بینائی پر اثر ہوا۔اس کے بعد دل کو وہم سا ہو گیا اس لئے یہ اصول بنالیا کہ بے شک کم سہی لیکن باہر ہی کی پیوں گا۔"

"اچھی بات ہے "لڑکی کچھ دیر توقف کر کے بولی" آپ لڑکیاں اکثر لاتے ہیں؟"

"تم پہلی ہو"

"جھوٹ" وہ شوخی سے بولی۔

"سچ"

"میں کیسے مان لوں"

"تم کون سا میری بیوی ہو اور یہ رات کون سی سہاگ رات ہے کہ میں تم سے جھوٹ بولوں گا۔تم واقعی پہلی ہو۔"

"دوسری۔"

"وہ کیسے؟"

"پہلی تو پھر بھی آپ کی بیوی ہوئی۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں شادی شدہ ہوں؟۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتی رہی۔

کچھ دیر اور گزر گئی۔

رات مزید گہری ہو گئی۔

نیچے بوفے ریسٹورنٹ بند ہونے لگا۔ ویٹر بتیاں بجھا کر جمائیاں لیتے ہوئے آخری مہمانوں کے جانے کا انتظار کرنے لگے۔

اوپر اعجاز پر سرور طاری ہونے لگا۔

"ہم یہ کیا فضول باتیں لے بیٹھے ہیں۔ آؤ زندگی کی باتیں کرتے ہیں، کچھ باتیں خوشیوں کی کرتے ہیں کچھ اپنے غموں کا بتاتے ہیں"۔ اعجاز باقاعدہ رومانٹک ہو رہا تھا۔

"بھلا مجھ جیسی لڑکیوں کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے، کوئی خوشیاں کوئی غم نہیں ہوتے۔ بس ایک روٹین ہوتی ہے۔" لڑکی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"تم تو سنجیدہ ہو گئیں۔ میں کوئی اچھی اچھی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ رونے تو روز اپنی بیوی کے بھی سنتا ہوں۔ اگر تم نے بھی ایسی ہی باتیں کرنا ہیں تو پھر تمہارا کیا فائدہ؟" اعجاز باقاعدہ جھلا گیا۔

لڑکی خاموش رہی اور ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے پر لگی نیل پالش کو کھرچنے لگی۔

اعجاز کچھ دیر اُسے تکتا رہا پھر آہستگی سے بولا "میرے قریب آجاؤ۔"

لڑکی بے تکلفی سے اس کے قریب آ گئی۔

اعجاز نے ایک بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔

وہ کچھ نہ بولی جیسے ذہنی طور پر تیار ہو گئی ہو۔

اعجاز کا جسم سلگنے لگا تھا مگر اس نے خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔

باہر رات بھیگ رہی تھی۔

اعجاز نے خاموشی سے تھک کر لڑکی کی گود میں اپنا سر ڈال دیا اور بستر پر لمبا لیٹ گیا۔

لڑکی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"تمہیں کیسا لگتا ہے جب ہر رات ایک نیا مرد تمہارے ساتھ سوتا ہے؟" اعجاز نے

استفہامیہ انداز میں سکوت توڑا۔

" کیسا لگ سکتا ہے؟" لڑکی کے سوال ہی میں جواب تھا۔

" کیا میں برا آدمی ہوں؟"

"وہ کیوں؟" لڑکی کی انگلیاں بالوں ہی میں تھم گئیں۔

" تمہیں خرید کر جو منگوایا ہے۔ بھلا اچھے مرد عورت کو خریدتے ہیں۔"

لڑکی کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔

اعجاز نے اِن آنکھوں میں جھانکا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان میں ایک نامعلوم سا ننھا سا شعلہ جلا ہو اور جل کر بجھ گیا ہو۔

پھر وہ بولی تو اس کا لہجہ ناہموار تھا۔

" آپ باقی بہت سے مردوں کی طرح جانور نہیں۔ پھر آپ مجھے خرید کر جو لائے ہیں تو مجھ پر احسان کیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" اعجاز نے پھنسی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اگر آپ میرے لئے پیسے نہ دیتے تو میرے گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوتے۔ میرے چھوٹے بہن بھائی پڑھ رہے ہیں۔ اُن کی فیسیں کہاں سے آتیں۔ آپ تو اچھے آدمی ہیں۔ میری ضرورتیں پوری کر رہے ہیں"۔ وہ جیسے کچھ مزید بولتے بولتے رک گئی۔

اعجاز کو دکھ ہوا۔

اس کے جلتے جذبات پر پانی سا پڑ گیا۔

" مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ کیا تم واقعی پیشہ ور نہیں ہو؟۔"

"پیشہ ور۔ وہ تو میں ہوں۔ مگر زیادہ تجربہ کار نہیں۔ پہلے ایک دفتر میں کام کرتی تھی، باس نے مجھے خراب کر دیا۔ میں نے نوکری چھوڑ دی۔"

" پھر؟"

" کئی جگہوں پر نوکریاں کیں۔ مگر اس شہر کے" اس نے اٹک اٹک کر کہا" ہر دفتر میں مجھے خراب کیا گیا۔ ایک مرتبہ پولیس کے پاس بھی گئی تھی۔ خیر چھوڑیے۔ آخر کار میں نے سوچا کہ

یہی کرنا ہے تو صحیح طریقے سے کیوں نہ کروں۔ پھر میڈم مل گئیں۔ بہت اچھی ہیں۔ شروع ہی میں قرض کے طور پر مجھے خاصے پیسے دے دیے۔"

وہ اضطراری طور پر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی مسلنے لگی۔

پھر ایک دھیمی سی آواز کمرے کی فضا کو چیرتی چلی گئی۔ "آپ جیسے مردوں سے بہت بہتر ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی اور خاموشی کے نل سے بے چینی قطرہ قطرہ ٹپکتی رہی۔

وہ نیم وا نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر اور سرد خاموشی فضا کو منجمد کرتی رہی۔

"سوری" وہ بولی تو اس کے لہجے میں ندامت کی حرارت نمایاں تھی۔

"کوئی بات نہیں"۔ اعجاز گویا کچھ سمجھتے ہوئے بولا۔

"تم مردوں کے بہت خلاف ہو کیا بات ہے؟۔" اعجاز بڑبڑایا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہو۔ پھر بولی ''شروع میں میڈم نے سمجھایا تھا کہ یہ بھی ایک پیشہ ہے۔ بلکہ مردوں کے بہت سے پیشوں سے کم محنت والا۔ سڑک پر پتھر کوٹنے اور اونچی عمارتیں تعمیر کرنے والے کاموں سے کہیں زیادہ آرام دہ۔ مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس میں عزت بھی بیچنا پڑتی ہے۔ اُنہوں نے سوچا ہوگا کہ میں خود ہی سمجھ جاؤں گی۔"

اعجاز نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں میں اس کی نرم لانبی انگلیاں تھام لیں اور پوچھا" وہ کیسے؟"

وہ پھیکی مسکراہٹ ہنسی "سب کچھ پوچھ لیں گے؟"

اعجاز اُمید سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے ایک لمبی سانس بھری اور بات جاری کی "شروع میں جب میرے گاہک نشے میں مجھے رنڈی کہتے تو مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔ پھر عادت ہوگئی۔ جیسے ہر چیز کی عادت ہو جاتی ہے۔ مگر پھر کچھ ایسے گاہک بھی ملے جو نہ جانے نشے میں مجھے مار پیٹ کر اپنی کون سی خواہش پوری کرنا چاہتے تھے۔ میں رو رو کر تھک جاتی تھی، اُن کے آگے ہاتھ جوڑتی تھی مگر وہ مار کر نہ تھکتے تھے۔"

یہاں پہنچ کر لڑکی کی آواز بھرا گئی "میرے ابا نے تو کبھی مجھے اُونچی آواز میں ڈانٹا تک نہ تھا۔"

اعجاز کے ہاتھ کانپے اور اُس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔لڑکی چونک گئی اور نرمی سے بولی" آپ فکر نہ کریں۔اب میں نے یہ کام بہت کم کر دیا ہے۔صرف کسی حوالے سے سوچ سمجھ کر ہی جاتی ہوں۔اور ہاں بعض عورتوں کو تو میں نے مردوں سے بھی برا پایا ہے۔میری کچھ ساتھیوں نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ کسی مرد نے بھی نہ کیا ہوگا۔شائد عورت عورت کو زیادہ دکھ دے سکتی ہے۔"

رات کا کوئی پچھلا پہر تھا۔

اعجاز پر غنودگی طاری تھی۔

لڑکی بھی نیند میں تھی۔ادھوری نیند۔اس کے چہرے پر ایک ناقابلِ بیان معصومیت تھی۔

اعجاز رات کے کسی انجان پہر میں چومتے چومتے اس سے لپٹ کر سو گیا تھا۔

صبح جب اعجاز سو کر اُٹھا تو لڑکی جا چکی تھی۔

چڑھے ہوئے دن کا یرقان زدہ اُجالا کمرے میں پیلاہٹ پھیلا رہا تھا۔

اس نے سامنے دیکھا تو بوتل کو تپائی پر نہ پا کر تذبذب میں پڑ گیا۔

"ساتھ لے گئی ہوگی۔"اس نے سوچا۔

پھر اس نے کسمسا کر کروٹ بدلی تو بھونچکا رہ گیا۔

اس کے ساتھ میں بے شکن بستر اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔

اُس نے کچھ تذبذب کی تپش پر سلگتی اور کچھ اطمینان کی پھوار سے ٹھنڈی پڑتی سانس لی۔

اور پھر وہ کافی دیر تک سوچتا رہ گیا کہ رات کو اس نے جو کمرے میں اطلاعی گھنٹی کی آواز سنی تھی کیا وہ بجی بھی تھی۔

سوڈے کی بوتل

رات میں کیمرے کی روشنی کا جھماکا ہوا، ایک خوبصورت لڑکی کا چہرہ چمکا۔ جُورا مُسکرا کر کچھ بولا۔ لڑکی اس کے چہرے پر جھکی اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

ایک تو جون کی تپتی ہوئی گرم ہوا میں رچی سمندر کی نمکین نمی نے اُس کی اوجڑی سی جلد کو نچوڑ ڈالا تھا اوپر سے جُورا تھکاوٹ کے مارے ہانپ کر رہ گیا تھا۔

''بھلا ایک انسان کا کُتے سے کیا مقابلہ'' جُورے نے طنز سے سوچا

''کتے کے دانت اور نظر تیز، دوڑ میں تیز، سونگھنے میں تیز اور پھر دماغ میں تیز۔ بھلا انسان کا کتے سے کیا مقابلہ''۔ اُس نے ہانپتے ہوئے پھر سے سوچا اور فاتحانہ انداز میں گٹھڑی کھولنے لگا۔

گٹھڑی میں خشک اکڑی روٹی کے سالن میں نیم لتھڑے ٹکڑے اور ادھ کھائے سیب اور خربوزے تھے۔

اتنے میں غراہٹ کی آواز دوبارہ اُس کے کانوں میں پڑی۔ سامنے وہی کتا دانت

تکوں سے غرّا رہا تھا۔

''چل تیری بہن کو..........'' جورے نے تاک کر اینٹ دے ماری۔ کتا سسکارتا چیختا وہاں سے بھاگ گیا۔

یہ واقعہ پہلے بھی اس کے ساتھ ہو چکا تھا۔

بندرگاہ کی بغل میں جیٹی کے ساتھ ہی کئی پُل ٹریفک کے سُبک بہاؤ کے لیے ایک دوسرے کے اوپر بنائے گئے تھے۔ اُنہی پُلوں میں سے ایک پُل کے نیچے جورے نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔

اُس صبح جورا حسبِ معمول جلد بیدار ہو گیا اور لنگر انداز اور رُخصت ہوتے جہازوں کو بے دھیانی سے دیکھ رہا تھا کہ اُسے سائرن کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی۔

اس پر جورے کی آنکھوں میں جان پڑ گئی۔

برق رفتار گاڑیوں کا قافلہ اپنے معمول کے رُوٹ پر پُل کے قریب سے گزرا تو جورا حسبِ معمول گھسٹ کے آگے ہوا اور سائرن بجاتی گاڑیوں کو سیلُوٹ داغ دیا۔

اِدھر وہ اُٹھا، اُدھر کُتا اُس کی گٹھڑی لے بھاگ ہی رہا تھا کہ جورے نے لمحے کے سولہویں حصے میں گٹھڑی کا کونا پکڑا اور قریب میں پڑا ایک پھٹا پرانا جوتا چناخ سے کتے کی تھوتھنی پر دے مارا۔

یہ اُسی شام کے گہرے ہونے کے وقت کا واقعہ ہے جب جورا اور نُورا تازہ بُھنے ہوئے گوشت اور گرم چپاتیوں کا کھانا کھا کر آسودگی سے پُل کو کندھے پر اُٹھائے ایک ستون سے ٹیک لگا کر خُمار میں قریب سے گزرتی گاڑیوں کی بتیوں کو دیکھ رہے تھے کہ جورا بول اٹھا۔

''نُورے یار بچپن میں جب میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا تو ہم تنکوں کے کونوں کو آگ لگا کر جلا لیتے تھے اور پھر پھونک مار کر بجھا دیتے تھے۔ بس آگ کی روشنی کونوں میں رہ جاتی تو تنکوں کو خوب گھماتے۔ کبھی کبھار مجھے اِن موٹروں کی بتیوں کو دیکھ کر وہ کھیل یاد آ جاتا ہے''۔

نُورے نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔

''جورے کیا ضرورت تھی تجھے کتا خصی کرنے کی۔ لے جانے دیتا کُتی کے بچے کو۔''

''اب تُجھے بتا کر غلطی ہی کی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ رات کو کوئی مَوج کرا دے گا۔ اور لے 'دوسری باتیں چھوڑ اُس میں یہ بھی تو تھا۔''

جورے نے مست ہو کر پُڑیا کھول دی۔

سیاہی سمندر کی تہہ سے نکل کر ہر سُو پھیل گئی۔

نورے نے مطالبہ کر ڈالا

''نہ کیا کر سلام بتی والی گاڑی کو۔ کیا دیں گے تجھے۔''

جورے نے اندھیرے میں گُم ہوتے جہاز پر نظریں جما دیں۔ پھر ایک کش لگا کر بولا

''نورے میں سوڈے کی بوتل ہوں جس میں یہ نمک چھڑکو تو پرانیاں باتاں اُبل آئیں ہیں''۔

کچھ وقت اور سمندر بُردہوا۔

''ماں کہتی تھی کہ میرا بیٹا بتی والی گاڑی میں بیٹھا کرے گا۔ بس بتی والی گاڑی دیکھ کر ماں یاد آ جاتی ہے۔''

جورے کی آواز میں سمندر کی تمام تر گیلاہٹ تھی۔

''اور اب تُو پوچھے گا کہ یہ سب مجھے کیسے یاد ہے۔ اور میں کہوں گا کہ میرے پاس صندوقچی ہے۔ اور تو کہے گا کہ اپنے دماغ کی صندوقچی بند کر۔ اور میں کہوں گا کہ میں روز سُونے کی چابی لگا کر صندوقچی کو کھولتا ہوں اور خزانے پھرولتا ہوں۔ اور تو کہے گا کہ یا تو مرد بن کر ماں باپ کو تلاشا ہوتا یا پھر اس صندوقچی کو سمندر کی ڈونگیائی میں پھینک دُوں اور میں کہوں گا کہ اِن گوڈوں تکر کی ٹانگوں سے اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر ساری دھرتی پھر لی مگر گھر واپسی کا رستہ یاد نہیں آیا۔ چل پھر بھی یہ صندوقچی کیوں پھینک دوں۔''

ہوا سرسراتی ہوئی ان کے بیچ سے اسٹیشن کے بیچ سے گزرتی برق رفتار ریل کار کی طرح گزر رہی تھی۔

''نہیں پھینک سکتا یہ صندوقچی۔ اس میں بہت کچھ بند ہے۔'' جورا چیخا

نُورا ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''بھلا کسی نے اپنی ماں کو سمندر میں پھینکا ہے۔''

گو جُورے کے جواب وہی تھے مگر اُس کا ہذیان غیر معمولی تھا۔

''بول نُورے بول۔ آج تک گھر سے نکلنے والا کوئی گھر کو واپس ہوا ہے۔ اگر ہوا ہے تو یا تو وہ وہ نہیں تھا یا پھر وہ گھر وہ نہیں تھا۔'' جورے کے اندر کوئی جن بول رہا تھا۔

اس پر نُورا جھلا اٹھا۔

''جورے تجھے آج گوشت کا نشہ چڑھ گیا ہے۔ کتنی بار روکا ہے کہ خالی پیٹ گوشت نہ کھایا کر۔ تیرے دماغ کو چڑھ جاتا ہے۔ تجھے تو اپنی ماں کی شکل بھی یاد نہیں۔ خود بکا تھا تو نے کہ صرف کچھ یادیں اور کچھ آوازیں یاد ہیں تجھے۔''

اب نورے کی آواز بھی بھیگ رہی تھی۔ ''جورے اور تجھے اس کے بعد کا کچھ بھی یاد نہیں۔ بس یہی سچ ہے۔''

جورے کی آنکھیں چڑھ آئی تھیں۔ اُس نے خالی پُڑیا مَسل کر ساتھ میں پھینکی اور نُورے پر چڑھ آیا۔

''مجھے میری ماں واپس کر۔''

نورے نے خوفزدہ ہو کر جورے کو جھٹک کر دور کیا تو جورا گھمسن گھار چکرایا، اس کی سرخ جال میں لپٹی پیلی زرد آنکھ کے کونے میں کسی گاڑی کی بتی چمکی، ہونٹوں کا ایک کونا پھڑ پھڑایا اور وہ سڑک پر لڑھکتا چلا گیا۔

کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور دھم کی ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔

چند ملی جلی آوازیں ابھریں۔

''آؤ اپنی ویں میں ڈال لیتے ہیں'' نسوانی آواز سنائی دی۔

''کیوں زندہ لاش سر لیتے ہو''۔ مردانہ آواز گونجی۔

''جلدی سے ایمبولینس کو کال کرو'' ایک اور نسوانی آواز آئی۔ ٹوں کی آواز سے موبائل فون کی رابطے کی آواز سنائی دینے لگی۔

ساتھ میں لڑکی کی آواز گونجی۔

''اسد فوراً کیمرہ اور مائیک آن کرو۔۔۔۔میں آفس سے رابطہ کرتی ہوں۔''

اُدھر جیٹی کے پار فلیٹوں کی کھڑکیوں سے روشنی باہر اندھیرے میں جھانک رہی تھی۔ اندر کمروں میں زندگی مچل رہی تھی۔

ایک کمرے میں بچے کی آواز آئی۔

''امی جی یہ وہ سامنے والا پُل تو نہیں''۔

ٹی وی میں ایک لڑکی گاڑی کے اندر مائیک تھامے لائیو آرہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''آخر ہماری حکومت کو بے چارے بھکاریوں اور نشے کے شکار شہریوں کا خیال کب آئے گا۔ اب لیتے ہیں ایک کمرشل بریک۔''

سامنے چلتی گاڑی میں گھٹنوں سے نیچے کٹی ٹانگوں اور مٹیالے کھچڑی بالوں والا خون میں لتھڑا بھکاری کراہ رہا تھا۔

ماں نے جلدی سے بچے کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

''نہ چاندا ایسے پروگرام نہیں دیکھا کرتے۔''

اِدھر اُس گاڑی میں جس میں جورا پڑا تھا ایک آواز گونجی۔

''جلدی ہسپتال چلو۔ خون زیادہ بہہ رہا ہے۔''

اچانک گاڑی نے اسپیڈ پکڑ لی۔

باہر کی نمکین ہوا جورے کے کھلے ہوئے زخموں پر اس طرح پڑی جیسے سوڈے کی کھلی بوتل میں نمک۔ اُس کی یادیں پکّر کر کے باہر کو اُبل پڑیں۔

گاڑی کی آواز اور حرکت اس نے گویا سوتے جاگتے میں سُنی اور محسوس کی۔ اُسے شدید تھکاوٹ کا درد بھرا احساس ہوا پر اُس نے ایک آنکھ تھوڑی سی کھول ہی لی۔ اُسے ایک آواز گویا خواب میں سنائی دی۔

''ارے اس کی تو آنکھ میں بھی خون بھر آیا ہے۔''

کسی نے اس کی آنکھ پونچھی۔ دھندلاہٹ میں اُسے ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیا اور

بچپن کے کسی کھلونے کی جھلمل موسیقی سنائی دی۔

لڑکی رٹے ہوئے جملے اُگل رہی تھی۔

''یہ پروگرام آپ لائیو دیکھ رہے ہیں۔''

اُس نے خون میں نچڑی آنکھ بمشکل کھولی۔

کئی مدھم مٹے ہوئے چہرے اس پر جھکے ہوئے تھے جن میں صرف اس لڑکی کا چہرہ نمایاں ہو پارہا تھا۔گاڑی کی چھت کھلی تھی۔

اس کی نظر چھت سے باہر نکل گئی۔

اچانک اسے اپنے اہم ہونے کا نامانوس سا احساس ہوا۔

بخار کی مدہوشی میں اُس نے الفاظ کی قے کی۔

''نورے میری ماں ایسی تھی............''

پیشانی سے بہتا خون اس کی پلکوں پر پپڑیوں کی طرح جمنے لگا۔

اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سرسرائی اور حلق سے خرخراہٹ سی نکلی

''دیکھ نورے میں ماں کی دُعا سے بتی والی گاڑی میں بیٹھا ہوں۔''

گھومتی بتی والی ایمبولینس میں اس کے سامنے بیٹھی لڑکی نے جھک کر جورے کی بات سننے کی کوشش کی مگر اس کی خرخراہٹ ایمبولینس کے سائرن میں دب کر رہ گئی۔

مُنّے نے پکائی کھچڑی

امام دین نے جب اپنے نومولود پوتے کو شہد کی گھٹی دینے کے لیے اُس کے نرم و نازک ہونٹوں کو چھوا تو مُنّے نے اپنی آنکھوں کو تھوڑا سا کھولا، اُس کے ہونٹ نیم وا ہوئے، اُن میں سے ایک مہین سی کراہ نکلی اور شہد کے قطرے کو نگل کر وہ پھر سے مست نیند سو گیا۔ سارا شہد امام دین کی آنکھوں میں اُتر آیا۔ وہ والہانہ نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا اور اُس کے ننھے سے ہاتھ کو اپنی سال خوردہ اُنگلیوں پر دھر کر کچھ دیر سہلاتا رہا۔ پھر شدتِ جذبات میں 'لنگور کہیں کا' بول کر آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سیاہ ہوتی دیواروں اور زنگ آلود پنکھوں والے وارڈ میں کھانستے کراہتے نیم جان مریضوں کے بیچ سے گزرتے اور اُن کے پھل کے چھلکے فرش پر بکھیرتے' مَیالی چائے اور رنگین شربت کے چھینٹوں کی خستہ چادروں پر بوچھاڑ کرتے اور گٹھڑیاں سنبھالتے میلے سے تیمارداروں کو پھلانگتے ہوئے جب وہ وارڈ کی بھنبھناہٹ سے باہر کھلی تازہ فضا میں آنکلا تو اُس نے اپنے بیٹے شاہ دین سے دو ہی باتیں کہیں۔ پہلی یہ کہ اصل سے سُود کہیں زیادہ عزیز ہوتا ہے اور دوسری یہ کہ وہ مُنّے کو جلدی سے گھر لے آئے۔ پھر اُس نے ایک لمبی آہ بھری" پتہ نہیں میری کتنی زندگی ہے۔ بس دُعا ہے کہ اللہ موت کے وقت کلمہ نصیب کرے۔"

امام دین کا دیگر انسانوں کی طرح اپنی سوچ پر کوئی اختیار نہ تھا۔ایک انسان کو کسی وقت کوئی بھی خیال آ سکتا ہے۔اپنی بیوی سے پیار کرتے ہوئے یکدم محبوبہ کا تصور،عبادت کے دوران بہی کھاتوں کے حساب کا خیال، کسی انجانے مقام پر جا کر اپنائیت کا احساس یا پھر کوئی کتاب پڑھتے ہوئے کسی پرانے دوست کا خیال۔پھر اگر امام دین کو بہت بعد کے ایک وقت میں اُس بلبل کی یاد جھما کے سے آئی جو اُس کے بچپن میں بندوق کا نشانہ خطا ہو جانے کے باوجود اُس کی دھمک کے صدمے سے مرگئی تھی تو یہ خیال ایسا بے محل بھی نہ تھا۔اس سے کہیں زیادہ اہم ایک اور بات تھی لیکن یہ سب بہت بعد کی باتیں ہیں۔

مُنّے کی آمد نے تو گویا امام دین کی زندگی ہی بدل دی۔گویا قدرت نے اُسے ایک کھلونا دے دیا تھا۔شاہ دین مُنّے کی محبت میں شرابور اپنے باپ کو اُس سے کھیلتے دیکھ کر ہی سمجھ پایا کہ کیونکر یہ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ بچے کی طرح ہو جاتا ہے۔آخر کو اُس کا باپ بھی ایک ضدی بچے کی طرح ہو گیا تھا جسے کھیلنے کو ایک گڈا مل گیا ہو۔

مُنّے کا اپنے ماں باپ کے بہ نسبت زیادہ وقت اپنے دادا کے ساتھ گزرتا۔امام دین مُنّے کے کومل پیروں پر گدگدی کرتا تو اُس کی قلقاریاں دیر تک گھر میں گونجتی رہتیں۔پھر وہ مُنّے کے پیروں پر اپنی اُنگلیاں چلاتا ہوا اُس کی ٹانگوں تک لے جاتا تو جب مُنا منتظر مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ہونٹ کھولتا تو اُس کے سرخ بوٹی کی طرح کے بے دانت مسوڑھے نمایاں ہو جاتے۔پھر امام دین کی اُنگلیاں چلتی ہوئی مُنّے کے پیٹ تک چلی آتیں اور گوگو کی آواز کے ساتھ امام دین اپنے ہونٹ اُس کی ناف پر رکھ کر دبا دیتا تو مُنا یوں ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتا کہ اُس کی آنکھوں کے کونوں سے پانی کی دھاریں بہہ نکلتیں۔اس پر قریبی کھاٹ پر بیٹھا شاہ دین مصنوعی خفگی سے بول اُٹھتا۔

''ابا تُو بھی تو بس بچہ ہی ہو گیا ہے۔اب بس کر۔کہیں مُنّے کے گلے میں پھانس نہ آ جائے۔''

اِس پر امام دین اُسے کٹیلی نگاہوں سے دیکھتا اور دانت کچکچا کر سرگوشی میں پھنکارتا۔

''یہ تُو نہیں تیرا اجلا پا بول رہا ہے۔تُو بس اپنے کام سے کام رکھ۔ہم دادا پوتے کے بیچ

میں مت آ۔"

اس پر شاہ دین بے بسی سے کہتا۔

"ابا تُو نے تو کبھی میرے ساتھ تو ایسا لاڈ نہیں کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر میرا تو بس مُوت ہی خطار ہتا تھا۔ مُنّے کے تو بڑے نخرے اُٹھانے آ گئے ہیں تجھے۔"

اِس پر امام دین کھل کھلاتے ہوئے مُنّے کو دیکھتا اور پیار میں ڈوبی آواز میں کہتا۔

"بھلا تیرے جیسے نالائق کا میرے چاند سے کیا مقابلہ۔ دیکھ ذرا مُنّے کی پیشانی پر اُبھرتی لاٹ کو۔ اللہ بخشے تیرا دادا کہتا تھا کہ یہ لاٹ یا تو ولیوں کے ہوتی ہے یا پھر مہاراجوں کے۔ میرا مُنّا نہ صرف میرا بلکہ تیرے داوے کا بھی نام روشن کرے گا۔"

اِس پر شاہ دین ایک مطمئن 'انشاءاللہ' کہتا اور پھر سے اپنے دانتوں سے گنے کو چھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔

دادا اور پوتے میں ایک عجیب مانوس باہمی ہم آہنگی قائم تھی۔

ایک نیم سردرات کو جب مُنّا پیٹ کی تکلیف یا پھر کسی اور درد سے بے چین ہو گیا اور دوا کھا کر بھی اپنے ماں باپ سے نہ سنبھلا اور ساتھ کمرے میں سوتے امام دین کی آنکھ کھل گئی تو اُس نے نیند بھرے قدموں سے کمرے میں جا کر مُنّے کو آہستگی سے اپنی گود میں بھر لیا اور اُس پر کھیس ڈال کر اُسے باہر مکان کے برآمدے میں لے آیا۔ وہ مُنّے کو لوری دیتا جاتا "مُنّے نے پکائی کھچڑی۔ ساری کھا گئی چڑیا" اور ٹہلتا جاتا اور بیچ بیچ میں دم درود کر کے اُس پر پھونکتا جاتا۔

باہر صحن کی کیاریوں میں اُگتی خودرو جھاڑیوں پر اوس اُترتی رہی اور سیاہ شفاف آسمان کی کانچ پر کڑھے موتیوں سے تاروں کی جگمگ جگمگ دھیمی پڑتی رہی۔ دُور کہیں کتوں کے بھونکنے کی نوکیلی آوازیں خاموشی کی چادر پر چھید کرتی رہیں۔ یا پھر محلے کے چوکیدار کی سیٹی اور اُس کی سائیکل کی گھنٹی کی جلترنگ سطحِ سکوت پر ارتعاش کی لہریں جاری کرتی رہی۔

امام دین سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ مُنّے کے کانوں کو بار بار پھسلتے کھیس سے ڈھکتا رہا یہاں تک کہ مُنّے کی گردن ڈھلک کر امام دین کے کندھوں پر ٹھہر گئی اور وہ دھیمے خراٹوں کے ساتھ سو گیا۔ ایسے میں امام دین نے مُنّے کے ہونٹوں کو دھیرے سے چوما اور صحن سے ملحق اپنے

کمرے میں کھاٹ پر سیدھا جالیٹا اور مُنّے کو اپنے سینے پر اُلٹالٹا کر اُس کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر اُس کی کمر پر ریڑھ کی نازک ہڈی کے اوپر ہاتھ پھیرتا گیا اور سرگوشیاں کرتا گیا۔

''میرے بچے کے سارے روگ مجھے لگ جائیں۔ اللہ تجھے نظرِ بد سے بچائے۔ تُو تو ہے ہی اتنا پیارا کہ دادے کی اپنی نظر لگ جاتی ہے۔''

صبح سویرے جب شاہ دین فجر کی نماز کے لیے اُٹھا اور صحن میں لگے ہینڈ پمپ کے بھاپ اُڑاتے پانی سے وضو کر کے اپنے باپ کے کمرے میں آیا تو خراٹے لیتے باپ کے سینے پر سوئے مُنّے کو دیکھ کر مسکراتا رہ گیا۔

صبح جب پھیری والوں کی صداؤں ''آلو لے لو، کدو لے لو'' اور دفتروں کو جاتے بابوؤں کے اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں کے شور سے امام دین کی آنکھ کھل گئی تو وہ خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ روشن دان پر پھڑ پھڑاتی چڑیوں اور کھڑکی سے جھانکتی بجھی پیلی روشنی نے اُسے صبح کے ہو جانے کا احساس دلایا تو اُس نے پیار سے مُنّے کو ساتھ میں لٹایا۔ مُنّا ہڑ بڑا کر کراہا اور نیند کے خمار میں پھر سے گم ہو گیا اور وہ باہر برآمدے میں لٹکتے پلاسٹک فریم میں جڑے شیشے میں دیکھ کر تیل میں چپڑے بالوں میں کنگھا کرتے شاہ دین سے لڑ پڑا جس کی وجہ سے اُس کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ شاہ دین گھبرا جانے کی ناکام اداکاری کرتے ہوئے باپ کی ڈانٹ سنتا رہا اور دفتر جانے کی تیاری کرتا رہا۔

سارے میں دیسی گھی میں تلے جاتے پراٹھوں، پیاز اور سرخ مرچ میں تیار ہوتے آملیٹ انڈوں اور آلو کے قتلوں کی مہک پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ جب بھوترے پر چنگیریں اور پلیٹیں رکھے سر پر دوپٹہ سنبھالتی آ گئی تو امام دین اُسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

جب بیٹا اپنی موٹر سائیکل پر سے کپڑا اُتار کر اُسے اسٹارٹ کر کے دفتر جانے لگا تو وہ اپنے باپ کے پاس آیا اور اُسے منانے کے لیے اتنا ہی کہا ''چل چھوڑ ابا۔ تُو بھی جانتا ہے۔ یہ میں یا شیطان نہیں جو تیری نماز قضا کراتے ہیں بلکہ مُنّا ہے۔'' تو امام دین نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''چل چل اپنا رستہ لے۔''

اس پر وہ مایوس ہو کر موٹر سائیکل کو پھٹپھٹاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

اُس کے جانے کے بعد اُس نے اپنی بہو کو تنبیہ کی کہ وہ منّے کا خیال کیا کرے اور یہ کہ اپنے نالائق شوہر کو بھی سمجھایا کرے۔ بہو سر جھکائے سنتی رہی۔ پھر اُس نے ناشتے کے بھرے برتن اُٹھا کر اندر باورچی خانے کا رُخ کر لیا۔

ہمیشہ کی طرح اُس روز بھی امام دین نے ناراض ہو کر خالی پیٹ گلی کی نکڑ پر قائم چائے خانے کا رُخ کیا۔ وہ چائے خانہ ایک اونچے چبوترے پر دو گلیوں کے سنگم پر واقع تھا اور دونوں اطراف سے کھلا تھا۔ اُس کے سامنے ایک چھوٹی سی سڑک مرکزی شاہراہ سے جا ملتی تھی۔ شاہراہ پر چلنے والی بسوں، ویگنوں، کاروں اور رکشوں کی وجہ سے ایک پُر رونق ماحول چائے خانے کے گاہکوں کی نظروں کے سامنے رہتا تھا۔ اور پھر ہوٹل کی ایک اندرونی نکڑ پر گڑے چوبی تختے پر ایک پرانا ریڈیو دھرا تھا۔ ریڈیو کے اوپر میلے ہوتے کپڑے اور گوٹے کا غلاف تھا جس پر اسپیکر کے سامنے گولائی میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیے گئے تھے تاکہ اُس سے پھوٹتی فلمی موسیقی کی رنگین آواز میں کمی نہ آئے۔

چائے خانے کے اندر فلمی پوسٹر چسپاں تھے جن پر نیم برہنہ ہیروئنیں مختلف پوزوں میں دعوتِ نظارہ دیتی تھیں۔ البتہ اُن کے جسموں کے عریاں ہوتے حصوں پر نیلے اور سیاہ مارکروں سے جالیاں سی بُن دی گئی تھیں۔ اُنھی پوسٹروں کے بیچ میں ایک تختی آویزاں تھی۔

''یہاں پر ٹوٹی ہڈی جوڑنے کا بہترین انتظام موجود ہے۔ نیز موچ اور سوجن کا شرطیہ علاج بھی کیا جاتا ہے۔ علاج کے لیے رابطہ کریں۔ برکت پہلوان''

بورڈ پر ایک تیر بنا ہوا تھا جو ایک متصل کوٹھڑی کی جانب اشارہ کرتا تھا۔

چائے خانے میں پتیلوں اور پتیلیوں کے سامنے ایک اونچی گدی پر براجمان برکت پہلوان، امام دین کو شروشر و چائے کے ساتھ پاپے نگلتے ہوئے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب اُسے گاہکوں سے کچھ فرصت ملی تو وہ اونچی پیڑھی سے نیچے اُتر کر اخبار پڑھتے امام دین کے پاس لکڑی کے بنچ پر آ بیٹھا۔

''کیوں سرکار! لگتا ہے کہ آج پھر شہزادے سے جھگڑا ہو گیا۔''

امام دین نے تہہ کر کے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور گلی میں سے سائیکل پر پرانے اخباروں کے بنڈل لاد کر جاتے ردی فروش پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

''یار برکت قصور میرا ہی تھا۔ کیا کروں جب سے پوتا ہوا ہے اُس نیانے سے نظریں ہی نہیں ہٹتیں۔ کبھی نماز چھوٹ جاتی ہے تو کبھی وہ لنگور کپڑے پلید کر دیتا ہے۔''

برکت نے چھوٹے کو آواز لگائی جو محلے کے یار بیلیوں سے گپیں ہانکنے میں جت گیا تھا اور اُسے گھرُ کنے لگا۔

''کیوں بے یہ برتن تیرا ابا اُٹھائے گا۔ چل ٹاکی لگا اور وہ سامنے بالٹی میں پڑے تازہ دودھ کو پتیلے میں ڈال کر چولہے پر اُبلنے رکھ دے۔ آنچ آہستہ رکھنا۔ اور ہاں نظریں دودھ پر رکھنا۔ پھر دوبارہ ضائع ہو گیا تو کیا دودھ تیری بڑی۔''

اتنا کہہ کر وہ پھر سے امام دین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''دیکھ دینیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ نے تجھے بچہ نہیں کھڈونا دے دیا ہے اور بھلا پاک بچے کے مُوت سے کوئی ناپاک کیسے ہوتا ہے جھلیا۔ پھر اللہ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔''

اس پر امام دین نے ایک چھابڑی والے کو دیکھا جو گلی میں سورج کی ترچھی کرنوں میں گرما گرم شکر قندی کے قتلے نمک مرچ اور لیموں کا رَس لگا کر بیچ رہا تھا اور جواب دیا۔

''کہتا تو تُو ٹھیک ہے برکت۔ اللہ دلوں کا حال بہتر جانتا ہے۔ بس دعا ہے کہ وہ ایمان کی حالت میں کلمے کے ساتھ اٹھائے۔ کسی کا محتاج نہ کرے۔''

اب برکت کی توجہ پھر سے چھوٹے کی جانب مبذول ہو گئی تھی جو دودھ کے پتیلے کو بڑی سی صافی کے ساتھ چولہے پر سے سر کنے سے بچا رہا تھا۔

''چل پُتر شاباش اب ذرا ایک مگا پانی کا ملا دے۔''

پھر وہ دوبارہ امام دین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''دینیا پانی تو تھوڑی دیر میں اُڑ جائے گا صرف دودھ رہ جائے گا۔ پانی ملانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ دونوں میں یعنی جذبات میں بھی اور دودھ میں بھی۔ اب اس ٹوٹے ہاتھوں والے نیانے کو دیکھ۔ آج کل کے چھوکروں میں تو جان ہی نہیں۔ میں اِس جتنا تھا تو اچھے خاصوں

کو پچھاڑ دیتا تھا۔ بجلی کی طرح لپک تھی میری اور چھلاوہ تھا چھلاوہ میں۔ ادھر سامنے والا پہلوان جھکتا تھا اُدھر میں اُس کی ٹانگوں میں سے نکل کر ایسا پڑا کرتا تھا کہ اُسے دن میں تارے نظر آ جاتے تھے۔''

امام دین مسکراتے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اب تک اُس کے چہرے پر طمانیت آ چکی تھی۔

''ہاں یار برکت مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔ آخر کو میں بھی تو ایک وقت میں چھلاوہ تھا۔ جو موٹر سائیکل ہیرو نہیں دوڑا سکتا تھا میں اُڑاتا تھا۔ کیسے دہکتی آگ میں سے ہَوا کی طرح گزر جاتا تھا اور حرام ہے کہ کبھی شعلوں نے چھوا بھی ہو۔ آگ میں برف تھا میں۔''

برکت نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

''چل تُو نے تو دو چار فلموں میں اسٹنٹ مَین کر کے اپنا شوق پورا کر ہی لیا۔ مجھے تو تیری طرح فلموں میں کام کرنے کا شوق تو نہیں تھا پر دیکھنے کا ضرور تھا۔ تُو بڈھا ہو گیا ہے لیکن فلمیں تیرے اندر گھس بیٹھی ہیں۔ اب بھی تُو جو فلموں کا ذکر لے بیٹھتا ہے تو یہ عشق عمر سے ختم نہیں ہوتا۔ میری تو اور بات تھی۔ اُستاد فلمیں دیکھنے سے سختی سے منع کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اِس سے تر خواب آتے ہیں جو کسرت کرنے والے کی ہڈیوں میں گودے کی جگہ پانی بھر کر اُنھیں کمزور کر دیتے ہیں۔''

امام دین نے اُس کی بات بیچ سے اُچک لی۔

''برکت یار اندر کی بات ہے کہ اب بھی کبھی کبھار میرے خواب میں پوری فیچر فلم چل پڑتی ہے پر اب اِس عمر میں جوانی کے شوق کا کیا ذکر۔ بس اب تو چلا چلاؤ ہے۔''

دونوں نے اثبات میں سر ہلایا اور امام دین گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

دن ہفتوں میں بدلنے لگے۔

مُنّے نے اب چلنا شروع کر دیا تھا۔ جب اُس نے پہلا قدم اُٹھایا تو اس خوشی میں امام دین رات بھر نہ سویا۔ ایک روز وہ شاہ دین سے کہنے لگا۔

''پُتر جب مُنّا اپنی نازک انگلیوں سے میری داڑھی کے بال کھینچتا ہے تو مجھے اتنی تسلی

ہوتی ہے جو میں تجھے بتا نہیں سکتا۔ چھوٹے ہوتے تو بھی مجھے بہت پیارا تھا۔ شاید میں تب روٹی کے چکر میں اس بری طرح گم تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ تو کب ایکدم سے بڑا ہو گیا۔ اب میرے پاس وقت ہے۔ سومنے کو دیکھ کر میرا جی کرتا ہے کہ اس کی ساری خواہشیں پوری کروں۔ اسے حافظ قرآن بناؤں۔"

اس پر شاہ دین نے منے کو میٹھی نظروں سے دیکھا جو صحن میں بیٹھا اپنی ماں سے بالوں میں تیل لگوا رہا تھا۔ وہ جب کبھی کانچ کے رنگین بنٹوں سے کھیل رہا ہوتا یا پھڑ پھڑاتی مرغی کا ننھے ڈولتے قدموں سے بالکل بچگانہ انداز میں قہقہے لگاتے ہوئے پیچھا کر رہا ہوتا ایسے میں شاہ دین باپ کی ایسی ہی کسی بات پر بے اختیار بول اٹھتا۔

"انشاءاللہ۔"

ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ امام دین کی چست چال میں سستی آنے لگی اور کمر کا خم گہرا ہونے لگا۔

جب منا پہلی مرتبہ اپنے باپ اور دادا کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے گیا تو امام دین کی خوشی دیدنی تھی۔

ماں نے منے کو فجر کے وقت ہی اٹھا دیا تھا۔ وہ نیند کے سرخ خمار میں بار بار بستر پر ڈھے جاتا تھا۔ ایک رات پہلے تک وہ عید کی نماز پڑھنے کی توتلی تکرار کرتا رہا تھا۔ پر اب جب سر پر آن پڑی تھی تو کروٹیں بدل رہا تھا۔

جب امام دین بیٹے کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ کر واپس لوٹا تو اُس کی بہو روہانسی ہو چکی تھی۔

"ابا جی دیکھیں منا تو اُٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔"

وہ بہو کے پیچھے پیچھے کمرے تک گیا اور سامنے ترچھے لیٹے منے کو پیار سے دیکھ کر بولا۔

"لاڈلے کو صبح جلدی اٹھنے کی عادت جو نہیں بیٹا۔"

شاہ دین نے لقمہ دیا۔

"ابا جی اسے چھوڑ نہ جائیں۔"

امام دین تڑپ کر بولا۔

''چل چل اپنا رستہ لے۔ یہ ہمارے ساتھ ضرور جائے گا۔''

اتنا کہہ کر امام دین نے پیار سے منے کو اٹھالیا۔ منے نے کسمسا کر ایک لمبی ہونک بھری اور دادے سے لپٹ گیا۔ دادا اُس کا سر سہلانے لگا اور اُسے لے کر باہر صحن میں آ گیا۔

سر پر سفید ٹوپی، جسم پر منی سی روپہلی پھول دار شیروانی، پیروں میں سنہری تاروں والا کھسہ پہن کر، آنکھوں میں سرمہ لگوا کر اور کپڑوں پر عطر چھڑکوا کر منے نے جب اپنے دادا کی اُنگلی تھامی تو اُس کے اعتماد میں معصومانہ پختگی تھی۔

نماز تو خیر اُسے آتی ہی نہ تھی پر ساتھ کے نمازیوں کی پیروی میں اُس نے اِس خوبی سے نماز کی نقل کی کہ دادا صدقے واری ہو گیا۔ پھر نماز کے بعد وہ اپنے چند ہم عمروں سے بہت اہتمام سے گلے ملا۔

عید گاہ سے واپسی پر امام دین نے اُسے ایک اٹھنی دی کہ وہ اسے خیرات کر دے۔ اُس نے ضد کر کے اُس اٹھنی کو اپنی شیروانی کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ بہت بہلا پھسلا کر وہ اٹھنی اس کے ہاتھوں سے گداگروں کی قطار میں کھڑی ایک بڑھیا کو دلوائی گئی۔

پھر امام دین نے عید کی سنہری صبح کو جب ابھی ہوا میں سویرے کی تازگی تھی موتیے کا ایک ہار خرید کر جس کے وسط میں ایک سرخ گلاب بندھا تھا اور اُس میں بھینی کنواری مہک تھی کو منے کے گلے میں ڈال دیا۔

واپسی میں منے نے گداگروں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ البتہ فٹ پاتھ پر شیشے کے شوکیس میں سجے رنگین دمکتے پتھروں کے بیوپاری نے اُس کو مختصر وقت کے لیے متوجہ ضرور کیا لیکن پھر ایک رنگا رنگ غبارے اور میٹھے چھلے بیچنے والا اُس کے جی کو بھا گیا اور اُس نے مچل کر دونوں چیزیں خرید لیں۔

جب منا گھر میں داخل ہوا تو اس کے گلے میں پھولوں کا ہار، ایک ہاتھ میں گیس والا نیلا غبارہ اور دوسرے میں سرخ میٹھا چھلا تھا۔ ماں تو اُسے دیکھ کر صدقے واری ہو گئی اور پیار سے اُس سے میٹھا چھلا شرارتاً مانگا تو وہ باقاعدہ نخرے میں ناراض ہو گیا اور دادے سے لپٹ گیا۔

جب دادے نے ماں کو مارنے کی اداکاری کی تو وہ مطمئن ہو کر چھلا کھانے لگا۔
سبھی اُس کی اس معصومانہ حرکت پر ہنس پڑے تھے۔
عید کے چند روز بعد منا باقاعدہ طور پر امام دین کے ساتھ سونے لگا۔
اُس کے ماں باپ نے بھی کچھ دادا کی خواہش کو دیکھتے ہوئے اور کچھ بنیادی انسانی جسمانی جبلت کے زیرِ اثر اس پر اعتراض نہ کیا۔

اب امام دین رات کو عشا کے بعد منے کو اپنے ساتھ لٹا لیتا۔ ہاں وہ اس سے پہلے اس کو ماں کے حوالے ضرور کرتا، تاکہ وہ اسے پیشاب کروا لائے۔ آخر کو دادے نے فجر کی نماز پاک لباس کے ساتھ پڑھنی ہوتی تھی۔ اس کے بعد جب منا گرم بستر میں دادا کے ساتھ اس کے پیٹ پر اپنی ننھی سی ٹانگ ڈال کر لیٹ جاتا تو دادا اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتا جاتا اور کہانیاں سناتا جاتا۔ کبھی جنوں چڑیلوں کی کہانیاں منے کی حیران آنکھوں کو پھیلا پھیلا دیتیں تو کبھی پیغمبروں کی کہانیاں اُسے گہری معصوم سوچ میں گم کر دیتیں۔ یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں مند جاتیں اور وہ ایک لمبی سسکی لے کر سو جاتا۔ امام دین ہاتھ بڑھا کر بلب بند کر دیتا جو تب تک اس لیے جلتا ہوتا کہ منے کو اندھیرے سے ڈر لگتا تھا۔ تھوڑی دیر میں کمرے میں ہلکی خراہٹ اور بھاری خراٹوں کی آوازیں گونجنے لگتیں۔

عید کی نماز کے بعد سے امام دین منّے کو نماز کے لیے تیار کرنے لگا۔ جب شاہ دین نے اعتراض کیا کہ ابھی وہ بہت چھوٹا ہے تو اس کے باپ نے یہ کہہ کر اُس کی بات کو جھٹک دیا کہ وہ اپنا رستہ لے اور یہ کہ منے کے لیے مسجد سے مانوسیت ہی بہت کافی ہے۔

دادا صبح کی نماز پر تو منے کو نہ لے جاتا مگر دوپہر کو منے کو بہت اہتمام سے وضو کراتا اور اس کی انگلی تھام کر اُسے ساتھ لے جاتا۔ مسجد میں منا مستقل نمازیوں سے گھلنے ملنے لگا تھا۔ بلکہ ان میں سے چند ایک اس کے لیے کبھی کاغذ میں لپٹی برفی اور کبھی ٹافیاں لے آتے جو وہ واپسی پر بہت نفاست سے کاغذ کھول کر کھاتا۔ ایسے میں اُس کی رال ٹپکتی رہتی اور وہ قمیص کے بازو سے اُسے پونچھتا رہتا۔ راستے میں امام دین ملنے والوں سے علیک سلیک کرتا جاتا۔ کبھی کہیں رُک جاتا اور پھر سے چل پڑتا۔ کبھی کبھار برکت کے چائے خانے پر ٹھہر جاتا اور پیالی میں سے پرچ میں چائے

اُنڈیل کر پھونکوں سے اُسے ٹھنڈا کر کے منے کو پلاتا جاتا۔ برکت نے پیار سے منے کا نام باؤ پہلوان ڈال دیا تھا اور وہ اکثر منے کو پنجیری کی ڈلیاں تھما دیتا تھا۔ ایسے میں وہ کن انکھیوں سے امام دین کی آنکھوں میں بڑھتی چمک کو بھی پڑھ لیتا تھا۔

ایک روز جب شاہ دین کے آنے کا وقت تھا اور عصر کی اذان ہو چکی تھی تو امام دین منے کی انگلی تھامے مسجد میں داخل ہوا۔ اندر صفیں بندھ رہی تھیں۔ باہر ایک سفید سناٹا تھا۔ نمازی صفوں کے بیچ پیدا ہونے والے خلا کو پُر کر رہے تھے۔ امام دین منے کو پچھلی بچوں والی صف میں چھوڑ کر اگلی صفوں میں بڑھ گیا۔ اُس وقت مسجد میں گنتی کے ہی نمازی آئے تھے اور بچوں میں تو صرف مُنا ہی تھا۔ جب صفیں مکمل ہو گئیں تو امام کی پچھلی صف میں کھڑے موذن نے تکبیر پڑھنی شروع کر دی۔

اچانک پچھلی صفوں میں ایک فراتی ہوئی آواز بلند ہوئی اور ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ہر طرف سنسناتی ہوئی آوازیں بکھر گئیں اور ایک کٹا ہوا دھڑ امام دین کے کندھے سے ٹکراتا ہوا سامنے آن گرا۔ اردگرد سیمنٹ اور دھواں پھیل گئے۔ امام دین ایک دھکے سے سامنے دیوار کے ساتھ ٹیک کی حالت میں اس طرح جا گرا کہ اُس کا رُخ باہر کے دروازے کی طرف ہو گیا۔ اُسے کسی تکلیف کا احساس نہ ہوا۔ گرد جب بیٹھی تو کراہیں اور چیخیں بلند ہوئیں۔ اُس نے گویا خواب کی سی بے حسی سے سامنے دیکھا تو کچھ لوگ باہر کو بھاگتے اور کچھ اندر کو آتے نظر آئے۔ چند انسانی جسم اِدھر اُدھر بکھرے اور گھسٹتے نظر آئے۔ سب کچھ ایک مائع میں تیرتا محسوس ہوا۔ جیسے یہ سب کسی اور کے ساتھ بیت رہا ہو۔ پھر اُسے ایک شناسا سا شخص اندر کی جانب بھاگ کر آتا دکھائی دیا۔ اُس شخص نے اندر آ کر ایک کونے میں پڑے چھوٹے سے انسانی جسم کو ٹٹولا اور دیوانہ وار اُس کے سینے سے کان لگانے لگا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں امام دین کی سماعت سے یوں ٹکرائیں جیسے پانی میں غوطہ کھا کر نکلنے والے نیم بے ہوش شخص کی سماعت سے باہر کی آوازیں ٹکراتی ہیں۔ بے معنی آوازیں۔ بس وہ ایک ہی آواز کچھ سن کچھ سمجھ پایا۔

''بچہ دھماکے کے صدمے سے مر گیا ہے۔''

پھر اُس نے نیم سیاہی میں اُسی شناسا سائے کو اپنی طرف چیخ کر لپکتے دیکھا۔

اور اُس وقت اُس کے ذہن میں دو ہی جھماکے ایک لمحے کے لیے بجلی کی طرح لپک

گئے پہلا یہ خیال کہ فلموں کے برعکس موت کتنی اچانک اور حقیقی چیز ہے اور دوسرا ایک نقش اُس بلبل کا آیا جو اُس کے بچپن میں بندوق کا نشانہ خطا ہو جانے کے باوجود اُس کی دھمک کے صدمے سے مرگئی تھی اور وہ مدتوں حیران ہوتا رہا تھا کہ کیا کوئی بغیر چوٹ کے صرف صدمے سے بھی مر سکتا ہے۔

اتنی دیر میں روشنی کی ایک دھار آسمان سے اُتری اور زوردار دھماکے سے چھت نیچے آن گری۔

بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی کیوں کہ اصل بات تو وہ ہے جو شاہ دین نے اس واقعے کے بہت بعد اپنی بیوی سے کہی۔ اُس نے ایک رات جب اس کی بیوی منّے کو یاد کر کے رو رہی تھی اور اُن تمام ماؤں کی طرح جن کے چھوٹے چھوٹے بچے مر جاتے ہیں وہ صرف راتوں کو چھپ کر نہیں بلکہ دن کو بھی زار و قطار روتی رہتی تھی۔ تو اُس رات اُس نے اپنی بیوی کو کہا تھا۔

''مجھے ابّے اور منّے کے چلے جانے کا تو دُکھ ہے ہی پر ایک اور دُکھ بھی ہے۔''

اُس کی بیوی نے سرخ زخمی نظروں سے اُسے دیکھا تھا تو وہ بولا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ابا کا فرموت مرا ہے۔ کیوں کہ جب میں منّے کو گود میں اٹھائے ابّے کی طرف گیا تو وہ شہتیر کے نیچے دبا ہوا تھا اور بے ہوش تھا۔ میں نے اُسے جھنجھوڑا تو اُس نے آنکھوں کو آہستہ سے تھوڑا سا کھولا اور منّے کی لاش کو دیکھ کر بڑبڑایا'' منّے نے پکائی کھچڑی۔'' پھر اُس نے پھٹی چھت سے باہر آسمان کو دیکھا یہاں تک کہ اُس کی آنکھوں میں وہی سفیدی اُترنا شروع ہو گئی جو قربانی کے بکروں کی آنکھوں میں گلے پر چھری پھرتے ہوئے اُتر آتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اُس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ ایک دم مجھے اُس کی خواہش یاد آ گئی۔''

یہاں پہنچ کر شاہ دین کا جسم لرزنے لگا تھا۔ اُس کی بیوی اُسے خالی نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ وہی خوف زدہ کر دینے والی نظریں جن سے صرف ایک زخمی عورت ہی دیکھ سکتی ہے۔

پھر وہ بولا تھا۔

''میں ایک لمحے کے لیے منّے کو بھول گیا اور ابّے کے ترلے کرنے لگا کہ وہ کلمہ پڑھ لے۔ پر ابا پتھرائی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا یہاں تک کہ اُس کے ہونٹ تھوڑے سے ہلے۔ میں سمجھا

وہ کلمہ پڑھ رہا ہے۔ مگر جب میں نے اپنے کان اُس کے ہونٹوں سے لگائے تو وہ کہہ رہا تھا "چل چل اپنا رستہ لے۔"

اور تب وہ دونوں اُن زخمی بلیوں کی طرح رونے لگے جن کے بچے کوئی اُٹھا کر لے جاتا ہے۔

کامنی

بشیر احمد میرے محلے کا ایک انتہائی معتبر شخص ہے اور اِن دِنوں مجھ سے ناراض ہے۔

اُس کی گفتگو میں خوشبودار شربت کی سی مٹھاس ہے اور آنکھوں میں شمالی وادیوں میں اُگنے والی گھاس کی سی نرمی ہے۔ اُس کی لمبی لہردار سفید داڑھی میمنے کی اُون سے بُنی لگتی ہے اور ماتھے پر محراب کا نشان اِس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ سالہا سال سے محلے کی مسجد میں امام کی پچھلی صف میں بڑی باقاعدگی سے کھڑا ہوتا آیا ہے۔

لوگ اپنے بچوں کے شادی بیاہ کے معاملات میں اُس سے رائے لیتے رہتے ہیں اور اپنی گھریلو تقریبات میں اُس کی آمد کو مبارک سمجھتے ہیں۔

مگر اِن دِنوں وہ مجھ سے ناراض ہے۔

اِس ناراضگی کی وجہ جاننے کے لیے مجھے ماضی میں جانا پڑے گا جب ہم دونوں آتش جوان تھے اور گہرے دوست بھی۔

میں اور بشیر احمد ایک دوسرے کو بہت پرانا جانتے ہیں، اتنا پرانا کہ وہ دَور اَب ایک خواب سے زیادہ کچھ نہیں لگتا۔ یہ تقسیمِ ہند سے پہلے کی بات ہے جب میں اور وہ اندرونِ شہر میں

ہمسائے میں رہا کرتے تھے۔

میں شروع ہی سے خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا ہوں اور وہ شروع میں بہت کھلنڈرا ہوا کرتا تھا۔ مزاج کا یہ اختلاف ہی شاید ہماری دوستی کی بنیادی وجہ بنا۔

اُسے جوانی میں گائیکی کا بہت شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نوٹنکی میلے میں وہ سب سے پہلے موجود ہوتا۔ ہر نئی فلم کے پہلے شو میں شرکت کا وہ بھرپور اہتمام کرتا اور واپسی پر اُسے فلم کے بیشتر گانے سُر تال اور لے کے ساتھ ازبر ہوتے۔ پھر جب وہ لمبے پٹوں والے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اور آنکھیں موند کر گانا سناتا تو سماں باندھ دیتا۔ یہ اُس کی یادداشت کا کمال تھا اور یہ بھی اُس کی یادداشت ہی کا کمال تھا کہ اُسے محلے کی تمام نوبیاہتا اور کنواری لڑکیوں کے نام زبانی یاد تھے۔ پھر وہ حسب خواہش ان لڑکیوں کے نام گانوں میں شامل کر کے دھیمے سُروں میں گاتا اور سرمستی میں جھومتا جاتا تھا۔

کبھی کبھار وہ چوک بھی جاتا تھا اور گلی سے گزرتے ہوئے بے دھیانی میں کسی لڑکی کے نام والا گانا اُس کے بھائی بندوں کے سامنے گا جاتا۔ ایسے میں اچھے خاصے مسائل پیدا ہو جاتے مگر اُس کے رسوخ والے بزرگوں کی وجہ سے بیچ بچاؤ ہو ہی جاتا۔ بعد میں اُس کی سخت سرزنش کی جاتی۔ معافی مانگنے پر اُس کی جان چھوٹ ہی جاتی۔

آخر اُس نے مقدور بھر احتیاط شروع کر دی اور صرف اُن لڑکیوں کا نام گانوں میں شامل کرتا جن کے آگے پیچھے کوئی مرد ذات نہ ہوتی۔ وہ بہت والہانہ انداز میں اپنے دوستوں کی ٹولی کے ہمراہ ایسی چنیدہ لڑکیوں کے گرد منڈلاتا اور گا کر اُن کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتا۔

اُس میں ایک اور صلاحیت سیٹی کی تھی۔ وہ مختلف سازوں اور پرندوں کی آواز میں سیٹی بجا لیتا تھا اور اکثر اُس کی سیٹی کا مخاطب وہی لڑکیاں ہوتیں۔

اُس کی یہ حرکتیں اکثر مجھ پر بڑی طرح کھلتیں اور میں اُسے سمجھاتا مگر میرے مشوروں کو وہ میری بزدلی پر محمول کرتا اور میرا خوب مذاق اُڑاتا۔ جب میرا اصرار جاری رہتا تو کبھی کبھار وہ طیش میں آ جاتا اور مجھے نامرد کہتے ہوئے بھرپور جلی کٹی سناتا۔

ہمارے مکان سے ملحقہ چھوٹے سے مکان میں کامنی اپنی بوڑھی نیم اندھی کھچڑی بالوں اور جھریوں بھرے تھیلے سے پوپلے منہ والی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ کامنی کا باپ کسی حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا اور بیوہ کی بینائی مسلسل روتے رہنے سے متاثر ہوئی تھی۔ کئی برس سے اُن کی مالی حالت بھی ٹھیک نہ تھی۔ سرکار کی جانب سے بندھی پینشن کی رقم ناکافی تھی۔ سو اب لے دے کہ کامنی ہی تھی جو کچھ سلائی کڑھائی کر کے گھر کا گزارا چلاتی۔ میری اماں کے ساتھ اُس کی خوب بنتی تھی۔ اسی لیے مشترکہ دیوار کے اوپر سے عاریتاً مانگی گئی دالوں، چاولوں اور مصالحہ جات کا تبادلہ جاری رہتا تھا۔ کبھی کبھار اُن کے ہاں سے گھر کی مرغیوں کے انڈے بھی تحفتاً آ جاتے۔

ہمارے صحن میں پھدکتا میمنا بھی اُن ہی کی بکری نے جنا تھا۔

لیکن نہ جانے کیوں کامنی مجھ سے بہت چوکتی تھی۔ جب کبھی ہمارے ہاں اُس کا آنا ہوتا تو صحن میں تو خوب ہنستی ہوئی داخل ہوتی مگر مجھے دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ جاتی۔ میں کبھی گود میں لیٹی کتاب پر سے نظر اٹھا کر اُسے دیکھ لیتا تو وہ اپنے دوپٹے کا پلّو مروڑتی، لمبی سی چٹیا میں گندھے پراندے کو جھلاتی خوفزدہ ہرنی کی طرح دبے پاؤں میرے قریب سے گزر جاتی۔ ایسے میں اُس کی بادامی آنکھوں پر غلافی پلکیں ڈھلک آتیں اور تراشیدہ ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ جاتے اور ستواں نقوش اور کشادہ پیشانی والا نازک چہرہ اور بھی دلکش ہو کر معصومیت سے جگمگا اٹھتا۔

میری چنچل بجیا بانو بھی اُس کی کیفیت سے محظوظ ہونے لگی تھی۔ سو اُسے چھیڑ دیتی۔ یہ ایک مذاق ہی ہوتا۔ آخر وہ ہندو تھی اور میں مسلمان۔

بشیر کامنی کو پسند کرتا تھا۔

اس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار کرتا رہتا۔ وہ کامنی کے لیے لفظ ''میرا چوزہ'' استعمال کیا کرتا تھا اور اکثر اس کی یخنی پینے کی خواہش کا بہت بیتابی سے اظہار کرتا تھا۔ چند ایک مرتبہ اُس نے دانت پیستے ہوئے، کامنی کو کچر کچر چبا جانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ شروع میں تو میں نے اُسے منع کیا مگر پھر اُس کے ان طعنوں سے تنگ آ کر کہ وہ میری کیا لگتی ہے، میں نے فقط غصّے کے گھونٹ ہی پینے پر اکتفا کر لیا۔

ایک روز تو واقعی انتہا ہوگئی۔

ابھی آنکھوں میں چراغ بھی نہ جلے تھے کہ محلے میں لگے کمیٹی کے واحد نلکے پر مقررہ وقت پر پانی بھرنے آئی ہوئی کامنی کو تنہا دیکھ کر بشیر نے اُس کی کلائی تھام لی۔ وہ تو چاچا بختیار اپنی کھڑکی سے کامنی کو بشیر کی گرفت میں کانپتا دیکھ کر للکار اُٹھا۔ للکار سن کر بشیر نے گھبرا کر کلائی چھوڑ دی اور کامنی روتی گرتی اپنے گھر کو بھاگ گئی۔

اُدھر وہ بھاگی، اِدھر چاچا بختیار نے بشیر کو گریبان سے جا تھاما اور دو چار دھپے دے رسید کیے۔

اچھا خاصا تماشا بن گیا۔ لوگ باگ اکٹھے ہو گئے۔ اتنا بڑا وقت بشیر پر پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ آخر پیر پڑنے پر اُس کی گلوخلاصی ہوئی۔

اِس کے بعد اُس نے اپنی دیدہ دلیریوں پر اچھا خاصا بند باندھ دیا۔

اسی دوران تقسیم کے فسادات شروع ہو گئے اور صوبے کے مشرقی حصے سے مسلمانوں کے لٹنے پٹنے کی خبریں اِدھر کے ٹھہرے ہوئے ماحول میں ہلچل پیدا کرنے لگیں۔ ہندو اور سکھ سراسیمہ ہو گئے۔ چند عناصر نے موقع کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر اُن کو نقصان بھی پہنچایا لیکن ابھی ایسے واقعات اِکا دُکا تھے۔

آخر جب مسلمانوں کے قافلے اِدھر پہنچے تو فسادات مزید پھیلے۔ مرکزی بازار میں ہندوؤں کی تمام دکانوں کو لوٹ لیا گیا۔

اُنھوں نے عجلت میں ہجرت شروع کر دی۔

ہمارا محلّہ ابھی تک محفوظ تھا۔

آخر ہر طرف دھواں پھیلنے لگا۔ قہر کی دیوی کی خون آشام زبان باہر کو لٹک آئی اور وہ مزید انسانی خون کی بھینٹ مانگنے لگی۔

ایک روز کٹی پھٹی انسانی لاشوں کی ایک ٹرین شہر کے اسٹیشن پر آن لگی اور قہر کی دیوی شڑوپ شڑوپ انسانی خون پینے لگی۔

سرحد کے دونوں جانب بے شمار لڑکیوں کی عصمت دری کی گئی اور چھاتی بریدہ لاشوں کو بھنبھوڑ کر پھینک دیا گیا۔ بے شمار مردوں کی دھوتیاں، شلواریں اُتروا کر اُن کے مذہب کی شناخت

کی گئی اور پھر اُن کو قتل کر دیا گیا۔

ہمارا محلّہ ابھی تک غیر مسلموں کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ چند ایک جوشیلے جوانوں نے بھڑک کر اُٹھنے کی کوشش کی جن میں بشیر احمد نمایاں تھا مگر سنجیدہ بزرگوں نے اُن کو بہت متانت سے ٹھنڈا کر دیا۔

لیکن پھر بھی خوف کے باعث ہمارے غیر مسلم محلّہ دار دھوپ میں پگھلتی برف کی طرح گھٹنے لگے۔ جو چند ایک رہ گئے وہ یا تو اچھے حالات کی اُمید پر رُک گئے یا پھر مجبوری کی وجہ سے رہ گئے۔ کامنی اور اُس کی نیم اندھی ماں بھی اُنھی میں سے تھے۔ اُن کا اُدھر کون تھا جس کے آسرے پر جاتے۔ جہاں اُنھیں حالات کے بہتر ہونے کی اُمید تھی وہیں پر محلے کے بزرگوں نے بھی اُنہیں تحفظ کی یقین دہانی کرائی تھی۔

ایک روز میں اماں اور بجیا کو خالہ نذیراں سے ملانے قریبی قصبے میں لے کر گیا ہوا تھا کہ شہر کے حالات مزید بگڑنے کی خبر آئی۔ اماں کے دل پر ہاتھ پڑا اور وہ آیات کی تلاوت کرنے لگیں۔ بجیا بھی گھبرا کر رونے لگی۔ خالہ نذیراں کے اصرار پر ہم وہیں ٹھہر گئے۔ دوسرے روز میں نے شہر جا کر حالات جاننے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اماں نے شروع میں تو منع کیا مگر پھر مجھ پر آیات پھونک پھونک کر صدقے واری ہوتے ہوئے جانے کی اجازت دے دی۔

کچھ تصویریں یادداشت پر کیسی نقش ہو جاتی ہیں۔

اپنے محلے میں داخل ہوا تو وہ پہچانا ہی نہ جاتا تھا۔ وہ ایک نیم جلے کھنڈر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہندوؤں، سکھوں کے قریباً تمام مکان ڈھیر ہو چکے تھے اور اُن میں سے اَدھ جلی لاشوں سے اٹھنے والی سڑانڈ فضا کو متعفن کر رہی تھی۔ میں سوگواری میں چلتا، ملبے سے بچتا چلتا رہا۔ اس دوران چند ایک محلّہ داروں ہی سے سامنا ہوا جو تیز تیز قدم اٹھاتے قریب سے گزر گئے۔ ایک کتا جو کسی شیر خوار بچے کی جلی ٹانگ بھنبھوڑتا چلا جا رہا تھا، مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور ٹانگ کو وہیں چھوڑ، دُم دبا کر بھاگ گیا۔

میرے گھر کے دروازے پر کالک لپی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے دھکیلا تو کواڑوں نے جھرجھری لی اور دروازہ راکھ جھاڑتا اندر کو کھلتا چلا گیا۔ اندر سب سامان اُسی طرح دھرا تھا جس

طرح میں چھوڑ کر گیا تھا۔

گھر کی تسلی کر کے میں محلے کی خبر لینے دروازے سے باہر نکلا تو بھونچکا رہ گیا۔

کامنی کا مکان پوری طرح جل چکا تھا۔

میں نے اندر جھانکا تو صحن میں آنتوں کا گچھا سا نظر آیا ساتھ میں جلے بالوں کی راکھ تھی اور دیواروں پر خون کے چھینٹے تھے۔ مزید اندر گیا تو ملبے کے نیچے ایک لاش کی چٹخی ہوئی کھوپڑی جھانک رہی تھی۔

میں تھرا کر رہ گیا اور خوفزدہ ہو کر باہر کو لپکا، کسی شے میں پیر رپٹا اور میں زمین پر آ رہا۔ جی چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور میں اُس میں سما جاؤں۔ کچھ دیر وہیں پڑا رہا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ کس طرح مجھے چاچا بختیار نے سہارا دے کر اُٹھایا تھا۔ میں اُس سے لپٹ کر رو دیا تھا۔ ہاں شاید وہ بھی رویا تھا۔ پھر اُس نے مجھے اپنے گھر سے پانی پلایا تھا۔ ہم دونوں بہت دیر گم سُم رہے تھے۔ پھر وہ صرف تھوڑا ہی بولا تھا۔

کئی تصویروں کی طرح کئی آوازیں بھی یادداشت پر کیسی نقش ہو جاتی ہیں۔

اُنھی آوازوں میں سے ایک آواز اللہ بخشے چاچا بختیار کی بھی ہے۔ کنویں سے آتی آواز کہ بشیر نے بہت بُرا کیا تھا۔ اگر بڑھیا کی طرح کامنی کے سر پر بھی ہتھوڑا ہی مار دیتا تو اچھا کرتا۔ پھر اگر اکیلے ہی زیادتی کرتا تو اچھا کرتا۔ چلو اگر صرف یار دوستوں کے حوالے بھی کر دیتا تو اچھا کرتا۔ مگر آخر میں اچھا نہیں کیا۔

چاچا بختیار نے یہ بھی بتایا تھا کہ اُس نے بشیر اور اُس کے ساتھیوں کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر جوانی کے آگے بڑھاپے کی کہاں چلتی ہے۔ بس بشیر نے اُسے کافر کہہ کر پرے دھکیل دیا تھا۔

اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ کامنی نے سب کچھ ہونے دیا تھا' نہ چیخی، نہ چلائی، نہ فریاد کی تھی بلکہ وہ تو بولی تک نہ تھی۔ بس حیرت سے کبھی اُن سب کو دیکھتی تھی یا پھر آسمان کو تو آخر میں اُسے تیل چھڑک کر آگ میں جلانے کی کیا ضرورت تھی۔

اور تب میں نے سوچا تھا کہ بشیر احمد نے تو بس ایک ہی اچھا کام کیا تھا، کامنی کو آگ لگا

دی تھی۔

اس واقعے کو کئی دہائیاں گزر گئیں۔

ہم دونوں نے محلے بدل لیے۔

ہمارا تعلق تو تبھی ختم ہو گیا تھا۔

قسمت کی ستم ظریفی کہ بہت برس پہلے موجودہ محلے میں ہم پھر سے اکٹھے ہو گئے۔

یہاں پر وہ ایک نیک شخص کے طور پر جانا جاتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ واقعی نیک ہو گیا ہو۔ پر نیک لوگ تو دوسروں سے رنجش نہیں رکھتے مگر ان دنوں وہ مجھ سے ناراض ہے۔

شاید اس کی وجہ کامنی ہو۔

میں تو اس واقعے کو بھی بھول گیا ہوتا اگر کامنی دوبارہ جنم نہ لیتی۔

میں بھی بشیر احمد کی طرح پکا سچا مسلمان بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں جنموں وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا۔ پر کیا کروں کہ کامنی نے واقعی دوبارہ جنم لے لیا ہے۔

اور اب کے تو بشیر احمد کی اپنی نواسی کی شکل میں جنم لیا ہے۔

کیا خوب صورت سترہ اٹھارہ برس کی بچی ہے۔ بالکل کامنی جیسی سُندر اور معصوم۔

بس جب سے میں بشیر کے کان میں سرگوشی کرتا ہوں کہ اُس کی نواسی تو بالکل ہی کامنی ہے تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتا ہے۔

اب تو محلے والے بھی مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کامنی کون ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں پر جھوٹ نہیں بولتا کیوں کہ میں بھی بشیر کی طرح اچھا انسان بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔

چادریں

یہ خبر تمام حلقوں میں بہت حیرت اور بے یقینی سے سنی گئی۔ بہت سوں نے خبر سنتے ہی اس کی صحت پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ بہت سے سناٹے میں آ گئے۔ خبر بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے فضا میں فائر کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا جائے۔ پھر آہستہ آہستہ تمام آوازیں واپس آ جائیں۔ شروع شروع میں تو سناٹا رہا۔ جس نے خبر سنی سناٹے میں آ گیا۔ آہستہ آہستہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پھر چہ میگوئیوں میں قیاس آرائیاں شامل ہوتی چلی گئیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ سردار سندر سنگھ نے شراب چھوڑ دی۔ یقیناً کسی کو غلط فہمی ہوئی ہو گی لیکن جب دوستوں یاروں، ہم پیالہ و ہم نوالہ محفل نشینوں نے سردار سے استفسار کیا تو سردار نے اداس کھنڈر ہوتے چہرے کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔ سردار کا اثبات میں سر کیا ہلانا تھا کہ بے یقینی کی دھند چھٹنے لگی۔ دھند تو چھٹ گئی لیکن اس کے پس منظر کی کوئی تصویر واضح نہ ہو پا رہی تھی۔

''بھلا سردار اس عمر میں آ کر کملا ہو گیا ہے''۔ ہردھیان سنگھ نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشویش سے کہا۔

''مچھلی پانی کو چھوڑ سکتی ہے اور پنچھی ہوا کو لیکن سردار سندر سنگھ شراب نہیں چھوڑ سکتا۔

بلکہ شراب سردار کونہیں چھوڑ سکتی۔شراب تو سردار کے نام اس طرح لکھ دی گئی ہے جیسے سانس مورکھ بندے کے نام کے ساتھ'' شیورام نے فلسفیانہ انداز میں خود کلامی کی۔

''لواورلو۔سردار نے شراب پی ہی کب تھی۔وہ تو شراب کھاتا تھا' پہنتا تھا' اورتو اور وہ تو سوتا بھی شراب کے ساتھ تھا۔کبھی دیکھا نہ تھا سردار کو شراب میں گول گپے ڈبو ڈبو کر کھاتے جیسے نوالے کو شوربے میں ڈبو کر کھاتے ہیں۔مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں ہندوستان واپس جارہا تھا اپنے بیٹے کی سگائی کرنے تو سردار سے مشورہ کرنے آگیا کہ سردار اپنے نواسے نواسیوں کے لیے بدیس سے کیا لے جاؤں۔پتہ ہے سردار نے کیا کیا۔اندر گودام سے بڑھیا چاکلیٹ کا ایک ڈبہ اٹھا لایا کہ' جالے جا میرے بچوں کے لیے'۔میرے موٹے موٹے اتھرو بھر آئے آنکھوں میں۔وہ تو خانہ خراب امرتسر جا کر جو ٹین کے ڈبے پر پڑھا تو پتہ لگا کہ چاکلیٹ کی ڈلیوں میں بھی شراب بھری تھی۔واہ گرو کی۔۔۔۔'' پرتر سنگھ بولتے بولتے کچھ سوچنے لگا۔

لال خان جو بڑی دیر سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔اس نے گویا بات بیچ سے اچک لی۔'' ہائے مولا اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔سردار اگر خودکشی پر اتر ہی آیا ہے تو اسے بچانا پڑے گا۔ بھلا ہم اپنے یار کو پیاسا مرنے دیں گے۔اس کے تو جسم سے شراب کی خوشبو آتی ہے' اس کی رگ رگ میں نشہ دوڑتا ہے۔سردار تو ہوش میں آتا ہی دو چار لگانے کے بعد ہے۔اسے یہ نہ ملی تو وہ تو مر جائے گا۔کچھ کرو یارو کچھ کرو میرے جگر کو پیاسا نہ مرنے دو۔اس کو بچالو''۔بولتے بولتے لال خان ایک ثانیے کو رکا اور ایک بڑا گھونٹ بیئر کا بھرلیا۔پھر گویا بیئر کا گولا اس کے حلق میں پھنس گیا اور اس کی آنکھوں میں وفور جذبات سے سرخ ڈورے آنسوؤں میں تیرنے لگے۔

خالصہ نائٹ کی فضا میں اداسی تیرنے لگی۔یار دوست لال خان کو دلاسہ دینے لگے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ سب کے دل اس بری طرح سے بجھے ہوئے تھے کہ وہ اپرلے دل سے تو ایک دوسرے کو دلاسے دیتے تھے لیکن درحقیقت گویا اپنا ہی دل بڑھا رہے تھے۔

اپنے اپنے وطنوں سے دور پردیس میں سب یار دوست اس طرح سے رہتے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ایک تو وطن سے دور بدیس میں خون پسینہ ایک کرتے تھے۔ دوسرے کسی ہم زبان کا مل جانا گویا جنت کے مل جانے کے مترادف تھا۔بس آپس میں محبت اور

خلوص کے وہ گاڑھے رشتے قائم ہو گئے تھے کہ پانی کو شراب کرتے تھے اور شراب کو خون کرتے تھے۔ بھلا اس بھائی چارے کو اس ان لکھے معاہدے کو کوئی توڑے اور وہ بھی سردار سندر سنگھ انہیں گوارا نہ تھا۔

کہتے ہیں مرض کے علاج کے لیے اس کی تشخیص ضروری ہے۔ جب تک مرض کا پتہ نہ چلے اس کا علاج کیسے ہو۔ اب قیاس آرائیاں تشویش میں بدلنے لگیں۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی بولیاں بھی۔ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا کہ کیا سردار کو اس عمر میں آکر ہی فاتر العقل ہونا تھا۔ چلو اگر فاتر العقل ہو ہی گیا تھا تو اس کا علاج ڈھونڈنا یار لوگوں پر لازم تھا' لیکن مرض کا پتہ تو چلے۔

اگلے روز سویرے سویرے لال خان نے سردار کے فلیٹ کی گھنٹی جا بجائی۔ ابھی گھنٹی کی آواز ہوا ہی میں تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ سامنے سردار اپنے بنیان تہمد میں آنکھیں سرخ کیے کھڑا تھا۔ یوں دکھتا تھا کہ شب بھر کا رت جگا کر کے اٹھا تھا۔ چہرے پر ویرانی ہی ویرانی تھی۔ موٹی موٹی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور پرانی خضاب رنگی داڑھی سے سفید بال جھانک رہے تھے۔ یہ داڑھی ہمیشہ سیاہ ہی رہی تھی لیکن لگتا تھا کہ سردار نے پچھلے چار پانچ روز سے اسے رنگا ہی نہ تھا۔ لال خان کا دل بھر آیا اور وہ سردار کے سینے سے جا لگا۔ سردار نے تشویش سے باہر راہداری میں دیکھا کہ کوئی جھانک تو نہیں رہا۔ پھر لال خان کو دلاسا دیتا اندر لے گیا۔

''سردارا مجھ سے تیرا یہ حال دیکھا نہیں جاتا۔ کیوں اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ رب قسم بتا اگر کسی نے تجھے تکلیف دی ہے تو اس کا نام بتا۔ مردان کا پٹھان نہیں اگر اس کافر کے بچے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے خنزیروں کو نہ کھلا دیے۔ پردیس میں ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خون بھی پانی ہو گیا ہے۔ بتا کیا روگ تو نے سینے سے لگا لیا ہے کیوں یار دوستوں کو چھوڑتا ہے؟ بھائی لوگوں سے جدائی کرتا ہے۔ خانہ خراب اگر کسی سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو خبیث کے بچے کو تیرے قدموں میں لٹا دیتا ہوں۔ تیرے پیر بھی چاٹے گا اور معافی بھی مانگے گا۔ خدا کا واسطہ ہے یار نہ چھوڑ''۔

''تیرا تو دماغ ہی پھر گیا ہے خانا۔ آج تو بھی سردار ہو گیا ہے''۔ یہ کہہ کر سردار کی آنکھوں میں نمی بھر آئی۔ پھر اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''دیکھ خانا۔ ایک میں ہوں اور ایک میری پتنی۔ بال بچہ تو ہے نہیں۔ چند جان ساری

کائنات ہم دو ہیں۔ کیوں اس عمر میں آ کر کوئی نامراد بیماری لگوالوں۔ اپنی جان پر بھی بوجھ اور تیری بھابھی کے لیے بھی مشکل۔ پھر کیوں نہ یہ پیسہ جو شراب پر خرچتا ہوں کسی بھلائی کے کام پر لگاؤں۔ کچھ یتیموں کا خیال کروں۔ اپنے ہندوستان میں غریبی دیکھی نہیں جاتی۔ وہاں کھانے کو روٹی نہیں اور ادھر ہم کھانا بھی ولیتی شراب میں پکاتے ہیں''۔ سردار مصنوعی لہجے میں بولا۔

''چل تو نے شراب چھوڑی ہے پر یار سنگیوں کو تو نہ چھوڑ'' لال خان نے دلیل دی۔

''خانا سوچتا ہوں کہ سب یار بیلی پئیں اور میں بیچ میں خشکا بیٹھا رہوں اچھا نہیں لگتا۔'' سردار نے گویا توجیہہ پیش کی۔

پھر خود ہی مسکراتے ہوئے گویا ہوا ''سوچتا ہوں لدھیانے میں ایک سبیل لگا دوں۔ دن رات، ہر پہر مفت شراب ملے۔ جو پینے والے ہیں وہیں ڈیرے لگالیں اور جو بدذات نہیں پیتے وہ بوتلیں بھر بھر کر لے جائیں اور اپنے پُرکھوں کی یاد میں اس سے دیے جلائیں۔'' سردار سندر سنگھ اپنے مذاق پر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ جب حلق سے ہنسی کی گڑگڑاہٹ کچھ کم ہوئی اور بھینچی ہوئی آنکھیں کھلیں تو سامنے لال خان اسے حیرت سے دیدے پھاڑے تک دیکھ رہا تھا۔ پھر منہ میں خود ہی کچھ بڑبڑاتے ہوئے اپنے ہی دھیان میں الٹے قدموں چلتا ہوا فلیٹ سے باہر آ گیا جیسے سندر سنگھ کے دماغ کے پھر جانے کے صدمے میں اس کے اپنے حواس مختل ہو گئے ہوں۔

اُس شام سب خالصہ نائٹ میں اس مسئلے پر کڑھنے کے بجائے کسی حل پر پہنچنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ کوئی ایسا حل جو دیرپا بھی ہو اور سردار کو پھر سے شمع محفل اور جانِ بزم بنا دے۔ ان سب کا سندر سنگھ واپس لوٹ آئے۔ پھر سے جام لنڈھائے جانے لگیں اور دیسیوں کی اکثریت پر مشتمل گاہکوں کی جان میں پھر سے جان آئے۔

کافی سوچ بچار کے بعد سب اس نتیجے پر پہنچے کہ سردار ایک بند تجوری کی مانند ہی جس کی واحد کنجی شراب ہے۔ جب تک یہ کنجی نہ لگے گی تجوری نہ کھل پائے گی لیکن یہ تو کان کو سر کے پیچھے سے بازو گھما کر پکڑنے والی بات تھی۔ سو بات وہیں کی وہیں ٹھہری۔ آخر کسی طرح بہلا پھسلا کر سردار کو پلا دی جائے۔ لیکن سردار بہت چلتر تھا۔ اپنے سامنے بڑی چنبیلی کی خوشبو شاید نہ سونگھ پائے لیکن بہتی ندی میں انڈیلے گئے ایک جرعہ مئے کو سونگھ کر بتا دے کہ ابھی اس آبِ رواں میں

کس نسل کی جوانی نے غسل کیا ہے۔ بلکہ شاید اس آتش سیال کی عمر عزیز کے مہ وسال کا حساب بھی گنوادے۔

آخر کار سب دوست احباب ایک قافلے کی صورت میں سردار کے فلیٹ کے باہر جا پہنچے اور بالکونی پر کھڑے سردار سے پرزور مطالبہ کیا کہ وہ جس حالت میں ہے اسی حالت میں نیچے اترے اور ان کے ساتھ مارچ کرتا ہوا خالصہ نائٹ کو چل دے۔ سردار نے ہزار ہاتھ جوڑے ' سو ترلے ڈالے' رات کے اس پہر پولیس کے چوکس ہو جانے سے ڈرایا۔ ڈی پورٹ ہو جانے کے اندیشے سے آگاہ کیا لیکن کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ الناسب نے یک آواز ہو کر نعرے کی شکل میں اپنے مطالبے کو دہرانا شروع کر دیا۔

آخر کار سردار سندر سنگھ نے ان سب کے مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

اب سردار سندر سنگھ کی آنکھوں میں دنیا جہان کی رونق تھی۔ سرخ آنکھیں مے کے خمار سے روشن ہو رہی تھیں' الفاظ کی روانی طغیانی کی جانب مائل تھی۔ سردار کڑک رہا تھا۔

''بابو کہتے تھے کہ شراب سے حیا مر جاتی ہے۔ مگر خالصہ نے اس رات اس کو دیکھ بھی لیا۔ ہائے لدھیانے کی نرم گرم شامیں۔ اپنے یار ہر سکھ یار کا وہ کمرا۔ اس کے آگے کی وہ بالکونی جس سے نرم نرم شام کی ہلکی ٹھنڈی ہوا اندر کمرے میں منجی کی سفید چادر کو اڑاتی تھی اور بستر سے اتارتی تھی۔ وہاں منجی پر میرا اور میری سوہنی کا بدن اپنے جسموں کے بوجھ سے چادر کو ننگے فرش پر پھسلنے سے روکتا تھا۔ چادر تو نہ پھسلتی تھی مگر ہائے ہمارے بدن یوں پھسلتے تھے۔'' سردار خاموش ہو گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ چہرے پر سائے آتے تھے اور پھر روشنی چھا جاتی تھی۔ سب بیلی آنکھیں جھپکے بغیر اسے تک تک رہے تھے۔ اشتیاق سے اور پیار سے۔

''ہر سکھ یار سے میں ہمیشہ پوچھتا تھا کہ وہ اس کمرے کی منجی پر سفید براق چادر کیوں بچھاتا ہے تو وہ کہتا تھا کہ وہ ان چادروں پر اپنے پیار کی چھوڑی نشانیاں سنبھال لیتا ہے۔ کوئی درجن بھر چادریں اس نے سنبھالی ہوئی تھیں۔ کسی پر سرخی کی لالی تو کسی پر سرمے غازے کے نشان تو کسی پر...... بس کیا بتاؤں۔ کیا بتاؤں۔ ہائے گرو۔ خالصہ تو بس اب مر ہی گیا ہے۔ اب تو اس کا سایہ زندہ ہے۔ کوئی آدھ درجن چادریں خالصے نے بھی سنبھالی ہوئی تھیں' ' وہ خاموش ہو گیا۔

پھر بولا" خالصے نے اصول بنایا تھا کہ پیار کو پیار رکھنا ہے۔ پیار کرنا ہے تو ونجلی کی تان کی طرح، طبلے کی تھاپ کی طرح نہیں۔ سرسراتی ہوا کی طرح، تھپیڑے مارتے طوفان کی طرح نہیں۔ اپنی محبت کو ہتھیلی میں ہوا سے بچائے دیے کی طرح بچانا ہے کہ نہ دیا بجھے اور نہ ہی ہاتھ جلے۔ اب تو جانے کیا ہو گیا ہے آج کی کڑیوں کو۔ منحوس ماریاں شکلوں پر وہ زردی ہے جیسے کوئی نصیب جلا جوانی میں پیاؤ کی نشانی دے کر مر گیا ہو۔ زیادہ تیز ہوا بھی برداشت نہ کر پاویں۔ ہندوستان کا نام ہی ڈبو دیا ہے"۔

سردار گھونٹ بھرنے کو رکا۔

"اور وہ ہمارے وقتوں کی بھرے بدنوں والی جوان جوان زنانیاں تھیں کہ قابو کرنے کے لیے خالصے کو اکھاڑے میں کسرت کرنا پڑتی تھی۔ پھر بھی ان کی جوانی پورے کپڑے لتوں میں سے اپنا آپ منواتی تھی، پھٹ پھٹ باہر ہوتی تھی۔ اور اب کی پُو چے ورگیاں دو ٹکڑے ٹاکی باندھ کر بھی دُور بین سے تاڑنا پڑتا ہے"۔

سب ہنس پڑے۔

"سوگند گورو کی۔ کئی مرتبہ ایسی چِک پڑی تھی کہ کھاٹ سے اترا نہیں جاتا تھا اور بے بے کہتی تھی کہ گھٹ کسرت کیا کروں..... زنانیوں کے بدنوں میں اس طرح مچھلیاں پھڑکتی تھیں اور بدن ڈُل ڈُل کر باہر آتا تھا کہ جذبوں پر تو بند باندھنا ہی پڑتا تھا بدنوں کو بھی پکڑ پکڑ کر روکنا پڑتا تھا"۔

ہردھیان سنگھ بے صبرا ہوا جاتا تھا" سردارا لیکن تُو تو مطلب کی بات کی طرف آیا ہی نہیں۔ یہ ایک دم سے تجھے کیا ہو گیا تھا، کیوں دنیا تیاگ دی تھی؟ خشکی کی موت مرنا چاہتا تھا"۔

سردار سندر سنگھ کو جیسے کسی نے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ایک دم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے کسی نے منہ پر چانٹا دے مارا ہو۔ کچھ دیر تو گُم سُم خاموش رہا پھر گویا ہوا۔

"دیکھ ہردھیان سنگھا تو میرا بیلی بھی ہے اور بھائی بندو بھی۔ بلکہ تم سب میری جند جان ہو۔ اوئے میرے یار ہو۔ بس ایک بات یاد رکھنا۔ اب تم سے کیا چھپانا۔ اپنی زنانیوں کو شراب پر مت لگانا۔ بہت پچھتاؤ گے۔ اوئے زنانی کا ظرف پُو چے جتنا ہوتا ہے۔ گھٹ ڈوہنگیائی کا برتن

ہوتی ہے زنانی' جلدی بھر جاتی ہے' جلدی چھلک جاتی ہے' پھر اپنے آپ سے سنبھالی نہیں جاتی۔ ہم تو مرد جاتی کے لوگ ہیں' اونچی شان والے۔ ہماری تو عزت ہی ہماری جی داری میں ہے' ہماری یاری میں ہے' ہماری بھائی بندی میں ہے۔ اوئے ہماری تو رونقیں ہی جوانی کے رنگوں سے ہیں۔ بس اپنی زنانی کو شراب پر مت لگا نا۔ برداشت نہیں کرنا پاوے گی''۔

سردار بہکتا جا رہا تھا۔ اپنے ہی سرور کے مزے لے رہا تھا۔ لیکن بیچ بیچ میں جیسے ایک دم جھٹکے سے ہوش میں آجاتا تھا پھر آہستہ آہستہ مستی میں ڈوب جاتا۔

''بھلا اپنے یاروں سے بھی اپنا آپ چھپایا جاتا ہے۔ اپنی آنکھوں سے بھی اپنا بدن چھپاتے ہیں۔ بس ایک غلطی کر بیٹھا۔ اپنی زنانی کو شراب پلا دی۔ شروع میں نہیں پیتی تھی۔ اوئے تم لوگ تو رات کو اٹھ جاتے تھے۔ مگر مجھ پاپی کو یاری چاہیے تھی۔ کوئی میری بات سنے۔ میں سویرے تک جاگنے والا جنور۔ میرا تو دن ہی رات کو چڑھتا ہے''۔ یہ کہہ کر سردار کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

پھر جیسے ایک جھٹکے سے نیند سے بیدار سا ہو گیا۔

''اوئے راما اپنی زنانی کو شراب نہ پلائیں اور اگر پلا دی تو اس سے یاری نہ لگائیں۔ اپنی جند برباد کر دے گا۔ بس اپنے سے یہ غلطی ہو گئی۔ اپنے جثے میں خود ہی برچھی کھوب دی۔ اپنا آپ برباد کر دیا۔ اپنی زنانی سے یاری لگالی''۔

سردار کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''اوئے خالصہ تو جھوٹ بھی بکتا ہے۔ اپنی جند میں تو بس محنت ہی محنت ہے۔ روڑا پتھر ڈھوتے ڈھوتے شراب ڈھونے لگے۔ بچپن میں مزدوری کرتے کرتے پیاس بہت لگتی تھی۔ لگتا ہے کہ یہ وہی پیاس ہے جو ہڈوں میں اس طرح بیٹھ گئی ہے کہ بجھتی ہی نہیں۔ اوئے بے بے بہت دور سے پانی لاتی تھی۔ اوئے لدھیانے تو میں جوانی میں کبھی رہا ہی نہیں''۔

سردار کی آنکھیں شدتِ جذبات سے چمک رہی تھیں۔ وہ پوری طرح باہوش آنکھیں تھیں۔ بس زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''بابیو بس خالصے نے زنانی سے یاری لگالی اور اس سے سب کچھ بک دیا۔ لدھیانے

کی نرم نرم شام کی ہلکی ٹھنڈی ہوا۔ وہ منجی کی سفید چادر۔ وہ آدھ درجن خالصے کی چادریں۔ اوئے وہ سب جھوٹ بک دیا"۔

سردار نے گہری ہچکی لی۔

"بس اپنی زنانی بھی اپنے سے یاری لگا بیٹھی۔ وہ بھی اپنے سے یاری لگا بیٹھی" اس کے بعد سردار ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

کافی دیر اس کی یہ گردان جاری رہی۔ پھر توقف کر کے پھٹ پڑا۔

"اوئے سردار تو جھوٹ بکتا تھا۔ مگر وہ سچ بول بیٹھی۔ اوئے اس نے تو واقعی دو تین چادریں سنبھالی ہوئی تھیں۔ اوئے اس نے تو واقعی چادریں سنبھالی ہوئی تھیں"۔

سویرے سویرے سورج کی تازہ روشنی جب خالصہ ٹائٹ میں داخل ہوئی تو باسی ہوا باہر نکل رہی تھی۔ سب یار بیلی جا چکے تھے اور سردار میز پر سر ڈالے زوردار خراٹوں کے ساتھ گہری نیند سو رہا تھا۔

اولگا

وہ ایک روشن صبح تھی مگر اسے صبح کہنا مناسب نہ ہوگا کہ دن کے دس بج رہے تھے اور بودرم جیسے ساحلی تفریحی علاقوں کی صبحیں دس بجے کے بعد ہی شروع ہوا کرتی ہیں۔ رات کو دیر تک جاگنے کے بعد سیاح اکثر دن کے دس گیارہ بجے ہی آنکھیں ملتے بودرم کی اکلوتی شاہراہ پر مٹرگشت کرتے نظر آئیں گے۔ ایک روز قبل ہی اس Pension کے مالک نے، جہاں میں پچھلے روز استنبول سے طویل سفر کے بعد پہنچا تھا، مجھے بتایا تھا کہ بحیرہ قلزم کے ٹرپ کے لیے چھوٹے سمندری جہاز اور کشتیاں صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان روانہ ہوکر شام چھ سات بجے واپس لوٹ آتے ہیں۔

سو میں ساحلِ سمندر پر ایسے ہی کسی سفر کی تلاش میں چلا آیا تھا۔ ملنہ بھی زیادہ رش نہیں تھا اور اکا دکا کشتیاں اور جہاز سفر کے لیے تیار تھے۔ ان کے ملاح یا تو کشتیوں اور جہازوں کی نوک پلک سنوار رہے تھے یا پھر بار بر پر بیٹھے سگریٹوں کے لمبے لمبے کش لگا رہے تھے۔ سمندر کے پانی کا رنگ کچھ ایسا ہو رہا تھا جیسے نیلی روشنائی کی بہت بڑی دوات کسی نے اُس میں اُنڈیل دی ہو۔ جب پانی ساحل سے ٹکراتا تو شڑاپ کی آواز سے سفید جھاگ پیدا ہوتی اور پانی ایک باریک نمکین تہہ کو

چھوڑ کر واپس بسر کر جاتا۔ میں چلتا ہوا کافی دُور نکل گیا تو میری نظر ایک سجے سجائے جہاز پر پڑی جو پرانے بادبانی جہازوں کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ اُس نے مجھے پرانی جنگی فلموں کی یاد دِلا دی اور میں نے اُس کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے عملے نے مجھ سے میرے جُوتے لے لیے۔ ننگے پیر سفر کرنا وہاں کی روایت تھی۔ میں چلتا ہوا جہاز کے اگلے عرشے پر چلا آیا جو سمندر کی ٹھنڈی تازہ ہوا سے پیدا ہوتی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ عرشہ تقریباً خالی تھا۔ وہاں صرف دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ایک سنہرے بالوں اور نیلی پرکشش آنکھوں والی معصوم سی لڑکی تیراکی کے لباس میں بیٹھی دُور سمندر کی چمکتی سطح پر بگلوں کی طرح ڈولتی کشتیوں کو دیکھ رہی تھی اور دوسری تیرہ چودہ سال کی مقامی لڑکی اُس کی ساتھی لگتی تھی۔ جب میں عرشے پر آیا تو اُن دونوں نے میری طرف دیکھا اور ایک رسمی سا ہیلو کہہ کر دوبارہ سمندر کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

پہلی ہی نظر میں سنہرے بالوں والی لڑکی کے چہرے پر مجھے اپنائیت سی محسوس ہوئی جیسے یا تو میں نے اُسے پہلے کہیں دیکھا ہے یا پھر میں اُسے جانتا ہوں۔ زندگی میں کئی مرتبہ ہوتا ہے کہ آپ کسی شخص کو پہلی مرتبہ ہی مل کر اُس کے لیے اپنائیت کا ایک گرم جذبہ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں جب کہ بسا اوقات کئی ملاقاتوں کے بعد بھی کوئی آپ کو اجنبی لگتا ہے۔ ماہرین اس کا کھوج جینز میں لگاتے ہیں۔ بہرحال اُس لڑکی کے اندر مجھے ایسی ہی اپنائیت کا احساس ہوا کہ میں عرشے پر ہی ٹھیر کر ریلنگ تھام کر سمندر میں جھانکنے لگا۔

جہاز آہستہ آہستہ لوگوں سے بھرنے لگا۔ ان میں زیادہ تر گورے، چینی اور عرب نسل کے جوان لڑکے لڑکیاں تھے جو مل جل کر پس منظر میں لگے تُرکی گانوں پر ہلا گُلا کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں وسل بجی اور جہاز نے اپنا سفر شروع کر دیا۔

اب تک دِن کے دس سے بارہ بج گئے تھے۔ اس دوران میری کئی افراد سے شناسائی ہو گئی تھی۔ میرا نام تُرکوں جیسا ہے اس لیے ترکوں سے قدرتی طور پر جلد ہی انگریزی میں گپ شپ شروع ہو جاتی۔

سیاحوں میں زیادہ تعداد طالب علموں کی نظر آتی تھی جو یورپ کے مختلف ملکوں سے سیاحت کی غرض سے بودرم کے سستا، آزاد اور خوبصورت ہونے کی وجہ سے چلے آتے تھے اور

یورپ کی آبادی کے تناسب سے یہاں بھی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ تھی۔ اُن میں سے زیادہ تر نے اضافی لباس اُتار کر اور جسم پر سکن لوشن لگا کر جہاز کی چھت کا رُخ کیا۔ لڑکے بھی شارٹس پہنے وہیں کا رُخ کرنے لگے۔

جلد ہی عرشے پر تھوڑے سے لوگ رہ گئے۔ میرے ساتھ میں ایک برٹش لڑکی ہیلن کھڑی تھی۔ اس سے تعارف ہوا تو اُس نے بتایا کہ اُس کے ساتھ یونیورسٹی میں کئی پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے ہیں۔ پھر اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس کی قریبی ترین سہیلی بھی ایک پاکستانی نژاد برطانوی لڑکی ہے۔ جب میں نے اُسے عام تصور کے برعکس پاکستان کے بارے میں بہت کچھ بتایا تو وہ میری باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سنہرے بالوں والی لڑکی اُٹھ کر ہمارے قریب چلی آئی اور ہیلن سے اگلے مقامِ قیام کا پوچھا۔ میں پورا شیڈول پڑھ کر آیا تھا اُس لیے ہیلن کو تذبذب میں دیکھ کر بول پڑا 'ابھی کوئی آدھ ایک گھنٹے کا سفر ہے۔' اُس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ رسمی سا شکریہ ادا کیا اور ریلنگ کے ساتھ کھڑی ہو کر دھوپ والا سیاہ چشمہ لگا کر دُور دیکھنے لگی۔

میں اور ہیلن اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ جب میں نے اُسے وادی کیلاش کی رسومات کا بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر میں نے ہنزہ میں واقع 'ایگلز نیسٹ' کا ذکر کیا جہاں ایک مقام سے دنیا کی زیادہ سے زیادہ بلند ترین چوٹیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ریاست بہاولپور کے سابق والیان کی دولت کا تذکرہ بھی اُس کے لیے نئی چیز تھی۔ اس دوران سنہرے بالوں والی لڑکی بھی ہماری گفتگو کو بے اعتنائی کا نقاب اوڑھے دلچسپی سے سن رہی تھی۔

ابھی ہماری گفتگو چل ہی رہی تھی کہ ایک جزیرہ آ گیا اور جہاز لنگر انداز ہو گیا۔ ہیلن تیراکی کے لیے چلی گئی۔

اب عرشے پر صرف میں' سنہرے بالوں والی لڑکی اور اُس کی مقامی دوست رہ گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میری اور اُس کی نگاہیں ٹکرائیں تو میں نے ہیلو کہہ دیا اور ''عرفان'' کہہ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ مسکرائی اور ''اولگا'' کہتے ہوئے ہاتھ ملا لیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے جب اُسے یہ کہا کہ وہ میری نظر میں آنے والی پہلی ترکی لڑکی

ہے جس کے بال قدرتی طور پر ایسے گہرے سنہرے ہیں تو وہ بے اختیار ہنس پڑی اور بولی ''میں جرمن ہوں۔'' پھر اُس نے جرمنی کے کسی چھوٹے سے قصبے کا نام لے دیا۔ اس دوران اُس کی مقامی دوست بھی ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ ہم نے ہاتھ ملائے۔ میں نے جب اولگا کو پاکستان کا نام بتایا تو وہ بولی ''ہاں ہاں میں نے تمہارے ملک کا نام تو ٹی۔ وی پر بہت سن رکھا ہے مگر افسوس کہ میں حالات حاضرہ اور جغرافیے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتی۔''

اس پر میں نے اُسے بتایا کہ پاکستان انڈیا کا ہمسایہ ہے اور یہ کہ ٹرکی کا دوست ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے مقامی لڑکی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ وہ لڑکی بھی مسکرا اُٹھی اور بہت گرم جوشی سے پاکستان کا ذکر کرنے لگی۔ اُس کی گرم جوشی دیکھتے ہوئے اولگا کی بھی دلچسپی بڑھ گئی اور اُس نے بتایا کہ اُس کی ایک دُور پار کی سہیلی ہندوستان میں کنبھ کے میلے میں گئی تھی اور وہاں کے یوگیوں اور جوتشیوں کا بہت ذکر کرتی تھی۔ یہ سن کر میں نے اپنی ٹھوڑی کھجلائی اور اُسے بتایا کہ میں بھی علم دست شناسی کی کچھ شدھ بدھ رکھتا ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ اُس نے اشتیاق سے اپنے دونوں ہاتھ میرے آگے پھیلا دیے۔ میں نے جھجکتے ہوئے اُس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اُس کے عام یورپی لڑکیوں کے نسبتاً سخت ہاتھوں کے برعکس بہت ملائم ہاتھ تھے۔ ہاتھوں کی مہین گوری شفاف جلد کے نیچے نیلی نیلی رگیں زندگی سے دھڑکتی تھیں اور لامبی انگلیوں کے کونوں پر خوبصورت تراشیدہ ناخن نسوانیت کا شاہکار تھے۔

میں نے ہاتھوں میں جھانکتے ہوئے سوال داغ دیا کہ اُس کی اپنے بوائے فرینڈ سے حال ہی میں علیحدگی کیوں ہوئی ہے؟ وہ سوال سن کر حیران رہ گئی اور بول اُٹھی کہ مجھے اُن کی علیحدگی کا کیسے پتہ چلا؟ میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور عمومی نوعیت کی پیش گوئیاں کرتا چلا گیا اور وہ متاثر ہوتی چلی گئی۔ پھر یکدم اُس کا ہاتھ دھیرے سے نیچے کرتے ہوئے میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا کہ میں نے پہلی مرتبہ بلا قیمت کسی کو اتنا کچھ بتایا ہے۔ وہ سر کو پیچھے کی جانب جھٹک کر ہنس پڑی۔

پھر اُس نے بتایا کہ وہ پہلی مرتبہ جرمنی سے باہر نکلی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک سہیلی تھی جسے استنبول میں کوئی لڑکا مل گیا تھا جس کے ساتھ اُس نے آئندہ چند روز کا پروگرام طے کر لیا تھا۔

یہاں پر وہی مقامی ترک لڑکی اُس کی دوست بن گئی تھی جو اُس کی انگریزی پالش کرتی رہتی تھی اور یوں اُس کی اُستانی تھی۔ جب میں نے اُس سے تیراکی نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ بچپن میں کسی نے اُسے پانی میں دھکا دے دیا تھا۔ تب سے پانی کا خوف اس کے دماغ میں ایسا بیٹھا کہ وہ دوسروں کو تو تیراکی کرتے دیکھتی رہتی ہے مگر خود پانی میں اُترنے کی ہمت نہیں کر پاتی۔

ابھی باتیں جاری ہی تھیں کہ انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ہیلن اور دوسرے سیاح جہاز میں واپس آنے لگے۔ کوشش کے باوجود سلسلۂ گفتگو واپس نہ جڑ پایا۔ یوں بقیہ سفر ہیلن کے ساتھ خوش گپیوں میں کٹ گیا۔

شام کو جہاز ساحل سے لگا تو سیاحوں میں ایسی ہڑبونگ مچی کہ میں اولگا سے الوداعی ملاقات کے بغیر ہی جدا ہو گیا۔

اسی روز بودرم کی اکلوتی شاہراہ پر مٹرگشت کرتے' دکانوں اور کلبوں کو دیکھتے میں ایک کلب کے نیم تاریک گوشے میں آن بیٹھا۔ میں اب تک اولگا کو بھلا نہ سکا تھا۔ اُس کے سنہری بال' نیلی آنکھیں' متناسب جسم' خوبصورت ہاتھ اور سب سے بڑھ کر معصومیت بار بار نظروں کے سامنے آ جاتے۔ جہاں اُس سے اِس طرح بغیر ملاقات کے بچھڑنے کی خلش سی تنگ کرتی تھی وہیں چھٹی حس کہتی تھی کہ ایسے چھوٹے ساحلی قصبے میں اُس سے دوبارہ ملاقات ضرور ہو جائے گی۔

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ میری نظریں کلب کے دروازے کی جانب اُٹھ گئیں۔ میں چونک کر رہ گیا۔ سامنے سے اولگا اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ شام کے وقت صبح سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ سیاہ لباس میں اُس کا حُسن اِس طرح نکھر آیا تھا جیسے سُرمئی بادلوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا ہو۔ اس کے ساتھ اُس کی نوعمر اُستانی بھی تھی۔ وہ دونوں ہنستی ہوئی بار میں داخل ہوئیں تو ایک مرتبہ بار میں بیٹھے لوگ اُن کی جانب متوجہ ہو گئے۔ وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگی۔ کلب کی نیم تاریک اور دھوئیں سے بھری فضا میں مجھے بجلیاں سی کوندتی محسوس ہوئیں۔ اُس نے گہری سُرخ لپ اسٹک لگا رکھی تھی جو گورے چہرے پر بہت پیاری لگ رہی تھی اور سنہرے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو کلب کی جلتی بجھتی گھومتی روشنیوں میں سُلگ سُلگ کر بجھ رہے تھے۔ وہ میرے قریب آئی تو اُستانی کی کسی بات پر سر کو پیچھے کی جانب جھٹک کر ہنسی اور ساتھ

سے گزر گئی۔ نہ تو وہ میرے قریب رُکی اور نہ ہی اُس کے قدم ٹھٹھکے۔ میری نظریں اُس کا تعاقب کرتی چلی گئیں۔ وہ کلب کے بار والے حصے کو عبور کر کے ڈانسنگ ہال میں داخل ہو چکی تھی۔

ڈانسنگ ہال کیا تھا' شور وغل اور مستانہ ہڑبونگ کی آماجگاہ جہاں جوان جسم کان کے پردے پھاڑ دینے والی تیز موسیقی پر دنیا مافیہا سے بے پرواہ تھرک رہے تھے' لچک رہے تھے اور مدہوش ہو کر گر گر رہے تھے لیکن وہ ڈانس میوزک میری سماعت میں معدوم ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ ایک نامعلوم اور بے نشان سناٹے نے لے لی۔ میرے سامنے جوان جسم نہیں ناچ رہے تھے بلکہ رنگ برنگے نقطے لرز رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جب میں واپس اپنے حواس میں آیا تو وہ میرے سامنے ناچ رہی تھی' بجلیاں کڑک رہی تھیں اور ڈانسنگ فلور لرز رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور بال فلیش لائٹ کی طرح روشنیوں میں چمکتے اور پھر دوسرے چہروں کے پیچھے گم ہو جاتے۔ اس کا جسم ایک والہانہ لیکن پُر اعتماد حرکت میں تھا۔ موسیقی کی لے پر اس کے قدم فلور پر پڑتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ میرے دل پر پڑ رہے ہوں۔

کچھ دیر تو میں اُس کا ناچ دیکھتا رہا' پھر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتی تو ایک کونے میں اُس کی اُستانی بیٹھی نظر آئی۔

میں اپنی نشست سے اُٹھ کر اُس کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اُن نظروں میں آشنائی تھی۔ جب میں کُرسی کھسکا کر اُس کے ساتھ بیٹھ رہا تھا تو وہ مجھے بتانے لگی کہ جہاز سے اُتر کر جب کچھ دیر تک میں باوجود تلاش کے نہ مل سکا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ میں ہیلن کے ساتھ چلا گیا ہوں گا۔ اُسے جب میں نے مسکرا کر بتایا کہ میں تو خود اُن دونوں کو تلاش کرتا رہا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شائد میری عدم توجہی کو درشتگی سمجھ کر وہ وہاں سے چلی گئی ہیں' میں خود بھی چل دیا تو ہم دونوں اپنی اپنی غلط فہمیوں پر مسکرا دیے۔

تھوڑی دیر میں اولگا ہانپتی کانپتی ہماری طرف آئی تو اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ سانس درست کرتے ہوئے بولی "جیمز۔ تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ہم دونوں کافی دیر تمہیں تلاش کرتی رہیں۔"

میں نے مسکین سے لہجے میں اپنی صفائی پیش کی اور پوچھا کہ کیا وہ کلب کے پیچھے اوپن ایئر ٹیرس جو بحیرہ قلزم پر کھلتا تھا' پر میرے ساتھ بیٹھنا پسند کرے گی تو اس نے فوراً ہامی بھر لی اور یوں ہم نیم تاریک چیختے چنگھاڑتے کلب کی عمارت سے نکل کر پُرسکون بحیرہ قلزم کے کنارے آن بیٹھے۔

رات ایک دِن کا لبادہ اُتار کر دوسرے دِن کا پہناوا پہن رہی تھی۔

رومانوی جوڑے دنیا سے بے خبر باہم راز و نیاز اور بوس و کنار میں مشغول تھے۔ ایک لمبے بالوں والا ہپی نوجوان پاجامہ پہنے گٹار پر کوئی گیت گا رہا تھا۔ شائد اس نے زیادہ پی رکھی تھی یا پھر حشیش استعمال کیے ہوئے تھا کہ اُس کی زبان بار بار لڑکھڑا جاتی تھی۔ نیند کا دُور دُور تک نشان نہ تھا۔ میں نے اولگا کی طرف دیکھا۔ اُس کے بال سمندر کی ہوا میں لہرا رہے تھے اور ہلکی خنکی سے بچنے کے لیے اُس نے ٹانگوں کو جسم کے نیچے تہہ کر کے پورے بدن کو سیاہ لباس میں لپیٹ لیا تھا۔ وہ سمندر میں دُور کھڑے کسی جہاز کی مدھم پڑتی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ چاندنی کے ذرات اُس پر جھلملا رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تو جہاز کو دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھا تو میں اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جھینپ کر میں نے نظریں موڑ دیں۔ وہ سر پیچھے کی جانب جھٹک کر ہنسی اور بول اُٹھی "دیکھو' تم تو شرما کر بلش کر گئے ہو۔" میں بھی ہنس پڑا۔

پھر ہم نے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ مجھے اپنے جرمن قصبے کا بتانے لگی' اپنے چھوٹے سے باغیچے کا بتایا جہاں اُس نے خود پھول لگائے تھے۔ اُس نے اُن بڑے جرمن شہروں کا بھی بتایا جو اُس نے دیکھ رکھے تھے۔ میں بھی اُسے اپنے شہر لاہور کا بتانے لگا۔ اُسے شہر کی پرانی فصیل کے اندر قدیم شہر کا بتایا' کھانوں کا بتایا' اور لوگوں کی عادات کا بتایا۔ اُسے اُن پیشوں کا بتایا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہے تھے جیسا کہ برتنوں پر قلعی کرنے والے۔ بات چلتے چلتے شاعروں اور ادیبوں تک چلی گئی۔ میں نے اُسے ناصر کاظمی کا بتایا جو پورے چاند کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا تھا' گرمیوں میں آگ تاپتے ساغر صدیقی کا بتایا اور تارڑ کی پاسکل کا بتایا۔ وہ بہت متاثر ہوئی اور کہنے لگی کہ یہی لوگ تو قدرتی حساس فنکار ہوتے ہیں۔ پھر اُس نے مجھے جرمن ادیبوں کا بتایا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گو وہ زیادہ ادب تو نہیں پڑھی ہوئی مگر لوک جرمن شاعری اُس کے دِل کو اپنے لبوں سے

چوم لیتی ہے۔ جب اُس نے اپنے ہونٹوں کو گول کر کے مجھے یہ بات بتائی تو میرے دِل میں اُن ہونٹوں کو چوم لینے کی خواہش جاگی۔ میں اُسے اُردو کے رومانوی شعر سنانے لگا۔ وہ بہت دیر تک شعر سنتی رہی اور پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی" تم یقیناً ایک اچھے دِل کے مالک ہو اور مختلف ہو۔ آج کل کے جرمن لڑکوں کو تو ایسے شعر نہیں آتے۔"میں نے اس کے مرمریں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور لبوں تک لے آیا۔ لبوں کی نمی محسوس کرتے ہوئے اُس نے کسمسا کر اپنے ہاتھوں کو کھینچ لیا۔ میرے ہاتھوں میں صرف خوشبو رہ گئی۔

وہ آہستگی سے بولی" تم بہت جذباتی ہو۔ یاد رکھو ہم آج ہی ملے ہیں اور صرف دوست ہیں۔ ہم دونوں سیاح ہیں اور کل کو یہاں سے اپنے اپنے رستے پر چلے جائیں گے۔"

مجھے اپنی آواز دُور سے آتی سنائی دی" اولگا ان لمحات کو دلیل کی قید میں دینا دِل کے ساتھ ناانصافی ہے۔ میں کوئی اور خواہش نہیں رکھتا صرف تمہیں ہونٹوں سے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی" میں نے تمہاری دلچسپی جہاز ہی میں محسوس کر لی تھی لیکن میں ایک عملی لڑکی ہوں۔"

"اور میں بھی ایک عملی لڑکا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اُس کی انگلیوں کو چوم لیا۔ ایک واضح کپکپی اس کے ہاتھوں سے سفر کرتی ہوئی اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اور چاند کی جھلملاہٹ سمندر کے پانیوں سے سفر کرتی ہوئی اس کی نیلی آنکھوں میں نظر آنے لگی۔ شائد اسے کوئی پرانا دُکھ یاد آ گیا تھا۔

وہ رات عجب مدہوشی کی کیفیت میں گزری۔ میں نے اُس سے بہت سی باتیں کیں۔ اپنے بچپن کی باتیں، پالتو جانوروں کی باتیں، سفروں کی باتیں اور پہلے بوسے کی باتیں۔ وہ بہت توجہ سے میری باتیں سنتی رہی اور اپنی چھوٹی سی سادہ زندگی کی معصوم باتیں سناتی رہی۔ رات ڈھلتی رہی اور فضا میں مستی کی مہک بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جب بودرم کی جامع مسجد سے صبح کی اذان کی آواز بلند ہوئی تو ہم دونوں اپنے شکن آلود لباس درست کرتے اُٹھے اور اگلی شام ٹمپل کلب میں ملنے کا وعدہ کر کے سویرے کے گنے چنے سیاحوں میں گُم ہوتے چلے گئے۔

بودرم استنبول سے کئی گھنٹے کی مسافت پر واقع ساحلی تفریحی مقام ہے۔ یہ نوجوان سیاحوں کا گڑھ ہے۔ فیملیز اِدھر کا رُخ کم ہی کرتی ہیں۔ وہ مارمارس کو بودرم پر ترجیح دیتی ہیں۔ یہاں کے نائٹ کلب پورے ترکی میں مشہور ہیں۔ ٹمپل انہی کلبوں میں سے ایک ہے۔

اگلے روز میں سرِ شام ہی ٹمپل کلب میں آن بیٹھا۔ جینز کے اوپر سیاہ جیکٹ پہن کر میں کم فارمل نظر آنا چاہتا تھا۔ شام کو شروع ہونے والا انتظار رات کو ختم ہوا جب اولگا کلب میں داخل ہوئی۔ ایک فیڈڈ جینز کے اوپر ڈھیلی ڈھالی سُرخ ٹاپ پہنے وہ پچھلی رات کی نسبت بہت پژمردہ لگ رہی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ میری میز پر آئی اور بے دِلی سے کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کیا اور لائٹر جلا کر دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لے کر آنکھیں مُوند لیں۔ میرے دِل پر چوٹ سی پڑی۔ میں نے نرمی سے اُس کے میز پر دھرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کے اعصاب کو سکون کی ضرورت نظر آتی تھی اور میں اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولی ''جب سے میرے بوائے فرینڈ نے مجھ سے دھوکہ کر کے مجھے چھوڑا ہے میں بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔''

اُس نے ایک اور کش لیا اور آنکھیں دھیرے دھیرے بند کر لیں۔ پھر بند آنکھوں کے ساتھ وہ بڑبڑائی۔

''تم لڑکے اتنی آسانی سے لڑکیوں کو دھوکا کیسے دے لیتے ہو؟ اور پھر بھول بھی جاتے ہو۔''

ابھی میں اُس کے سوال کی تلخی ہضم کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اُس نے آنکھیں کھول کر میری طرف پُرسوچ نظروں سے دیکھا اور کھسیا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

''آؤ آج کہیں اور چلیں۔ کلب میں بہت شور ہے۔ ہاربر کے پاس ایک کیفے ہے۔ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

میں تھکے تھکے قدموں سے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ باہر کی تازہ ہوا میں پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے قریب کر لیا اور ہم دونوں قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور کوئی جرمن گیت دھیمی آواز میں گنگنانے لگی۔ پھر وہ اچانک رُک

گئی۔ میں نے تشویش سے اس کی جانب دیکھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ میری آنکھوں میں نمی تیرگئی اور اردگرد کی ہر شے پر ستارے دمک اُٹھے۔

ہم کینفے تک کس طرح پہنچے' مجھے خبر نہیں۔ کینفے میں کافی کے تلخ گھونٹ جب میرے وجود میں اُترے تو کچھ ہوش آیا۔

وہ رات بھی ہم نے باتیں کرتے گزاری۔ معصوم باتیں' بے معنی باتیں' بے ربط باتیں' ایسی ایسی باتیں جو شائد کبھی خود اپنے آپ سے بھی نہ کی تھیں۔ اُس رات میں نے خدا سے بہت دعا کی کہ صبح نہ ہو مگر پھر صبح کا تارا سیاہی مائل نیلے آسمان پر جھلملانے لگا۔

جانے سے کچھ دیر پہلے باتیں کرتے کرتے وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ پھر حلق سے کچھ نگلتے ہوئے بولی ''شائد میں کل قریب میں ازمیر چلی جاؤں۔ وہاں سے ایک آدھ ہفتے میں استنبول چلی جاؤں گی۔''

یہ سن کر میں خاموش ہوگیا۔ جب خاموشی ماحول کو بوجھل کرنے لگی تو میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ کی انگلی سے دوسرے ہاتھ کو مسل رہی تھی۔ پھر اُس نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ طاری کی اور اُسے بتایا کہ میں دو تین روز ابھی بودرم میں رہوں گا پھر واپس استنبول لوٹ جاؤں گا۔ میں نے اُسے بودرم کے اپنے Pension کا کارڈ بھی دیا اور اُس کی پشت پر استنبول میں نیلی مسجد کے قریب واقع اپنے ہوٹل کا پتہ بھی لکھ دیا۔

وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر کارڈ لے لیا اور اُسے تکنے لگی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو جیسے خود ہی کسی خیال میں چونک گئی اور بولی۔

''عرفان کاش تم جرمنی میں پیدا ہوئے ہوتے۔''

اس پر میں بجھے دل سے مسکرا دیا اور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

''بس خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔''

اس واقعے کے تیسرے روز رات کو میں بے دلی سے بودرم کی شاہراہ سے ملحقہ گلیوں میں پھر رہا تھا کہ ہیلن مجھے سامنے سے آتی نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی مہک آ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ بولی۔

''کیا ہم اس سے پہلے کہیں ملے ہیں؟''

میں بجھی ہوئی آواز میں بولا

'ہاں شائد۔''

اس پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور بولی

''تم ابھی ینگ ہو۔ دُکھی ہونے کے لیے پوری زندگی پڑی ہے۔ آؤ میں تمھیں اپنے گروپ سے ملواؤں۔''

میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ قریبی کلب میں اُس کا یورپئین اور دیگر قومیتوں کے لڑکے لڑکیوں پر مشتمل گروپ اونچے میوزک پر ناچنے میں مصروف تھا۔

میں ایک طرف بیٹھ کر اُن کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں اُس گروپ سے ایک لڑکا' ہیلن کے میری طرف اشارہ کرنے پر' نکلا اور مجھے انکار کرنے پر بھی کھینچ کر ڈانس فلور پر لے گیا۔

میں تھوڑی دیر بے دلی سے حرکت کرتا رہا۔ کچھ لوگ کلب میں آ کر ڈانس فلور میں ناچتے ہجوم میں شامل ہوتے رہے اور چند ایک ہجوم سے نکل کر جاتے رہے۔

وقت قطرہ قطرہ ٹپکتا رہا۔

جب میں تھک ہار کر بار کے کاؤنٹر کے ساتھ اونچی کُرسی پر آ کر بیٹھ گیا تو ہیلن جھومتی جھامتی میرے قریب آ بیٹھی اور کان پھاڑتی موسیقی میں ہنستے ہوئے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر چیخی

''یہ زلزلہ آ رہا ہے کیا؟''

میں نے شائستگی سے اُسے کندھوں سے تھاما اور اُس کے کان میں بولا

''تمھیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔''

اُس نے کلب کے بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا اور میرے بازو کو تھام لیا۔
''اِن سب لوگوں میں اس وقت تم ہی سب سے سوبر حالت میں لگ رہے ہو۔''
وہ بولی۔
میں اُسے سہارا دے کر دروازے کی طرف چلا تو وہ رستے میں بولی "تھینکس۔"
دروازہ کھول کر ہم ابھی گلی میں آئے ہی تھے کہ کسی نے مجھ سے رستہ لینے کے لیے پیچھے سے کہا "ایکس کیوزمی۔"
میں ہلکا سا مڑا تو سامنے اولگا تھی۔
قبل اس کے کہ میں اُس کے وہاں اچانک موجود ہونے پر حیرت سے کوئی سوال کرتا' اُس نے پہلے گویا سلوموشن میں مجھے دیکھا' پھر میرے کندھے کا سہارا لیے ہیلن کو دیکھا اور میرے قریب سے یوں اجنبیت سے گزر گئی جیسے وہ اُس پہلی رات کو کلب میں میرے قریب سے گزر گئی تھی جب اُس نے مجھے دیکھا نہ تھا۔

شکست

کوٹھی کے پچھلے لان میں پانی کی ٹینکی کے نیچے کتیا نے بچے دیئے تھے۔ روسی نسل کی سفید کتیا کے دونوں چھوٹے چھوٹے پلے یوں تو ٹینکی کے نیچے نظر نہیں آتے تھے لیکن اگر ذرا جھک کر کنکریٹ کی ٹینکی کے نیچے جھانکا جاتا تو تاریکی میں دو آنکھیں ضرور چمکتی نظر آ جاتیں۔ یہ کتیا کی آنکھیں تھیں۔ احساسِ ذمہ داری نے ان میں ایک عجیب وحشی چمک پیدا کر دی تھی۔ گو کہ انسانوں کے برعکس جانوروں کا احساسِ ملکیت عموماً ان کی ذات تک محدود ہوتا ہے مگر بچے پیدا کرنے کے بعد کتیا میں احساسِ ملکیت نے ایک عجب وحشت بھری مامتا بھر دی تھی۔ اگر کوئی پانی کی ٹینکی کے قریب جا کر نیچے جھانکتا تو کتیا اس طرح غراتی جیسے اپنے پہلو میں مندی آنکھوں کے ساتھ لیٹے نرم و ملائم ہلکے روؤں والے گلابی بچوں کو کسی بھی گزند سے بچانے کے لیے وہ ابھی حملہ آور ہو جائے گی۔

بینا اس صورت حال سے بہت Irritate ہوتی تھی۔ نہ جانے یہ کتیا کہاں سے آ کر اُس کے گھر کے ایک گوشے پر قابض ہو گئی تھی۔ اس کا تو بس اتنا ہی قصور تھا کہ اُس نے ایک مرتبہ گھر میں پھولوں کی ایک کیاری کے بارے میں مالی کو ہدایات دیتے ہوئے اس کتیا کو جھاڑیوں

سے ڈھکے ایک سرسبز گوشے میں چھپے دیکھ کر پیار سے پچکار دیا تھا۔ بس اُس کے بعد کتیا کبھی کبھار وسیع لان کے جھاڑیوں بھرے گوشے میں بیٹھی نظر آ ہی جاتی تھی۔ اُون جیسے سفید بالوں میں بنی' اکڑے کانوں' کھڑی دُم اور شفاف آنکھوں والی کتیا کسی اچھے گھر کی پلی لگتی تھی۔ اس بات نے بھی نینا کے دِل میں اس کے لیے رحم کا جذبہ ڈال دیا تھا۔ مگر نینا نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کتیا اس کی نرمی کا اس طرح سے ناجائز فائدہ اٹھائے گی۔ ایک روز نعمان کے دفتر چلے جانے کے بعد' نائٹ سوٹ پہنے وہ پچھلے برآمدے میں آ کر سبزے کی ہری مہک سے رچی تازہ ہوا کو انگڑائی لیتے ہوئے اپنے اندر بھر ہی رہی تھی کہ اسے پانی کی ٹینکی کے نیچے شور سنائی دیا۔ سامنے کام کرتے بوڑھے مالی سے اس نے شور کی وجہ دریافت کرنے کا کہا تو وہ لجاجت سے بولا ''بی بی جی وہ جو سفید کتیا تھی نا' وہی والی جو اگلے لان میں جھاڑیوں میں چھپی ہوتی تھی' اس نے رات کو ٹینکی کے نیچے بچے دیے ہیں۔ میں تو خود کوارٹر میں سو رہا تھا کہ آوازیں سن کر جاگ گیا۔ آپ اور صاحب کمرے میں اے۔ سی لگائے سو رہے تھے اسی لیے شائد وہاں آوازیں نہ گئی ہوں۔ میں نے پرانی بوری کا ایک ٹکڑا ٹینکی کے نیچے بچھا دیا تھا اور پیالے میں پانی ڈال کر بھی رکھ دیا تھا۔ صبح صبح دودھ والے سے الگ سے دودھ لے کر ابھی دودھ بھی پلایا ہے۔''

یہ سن کر نینا غصے سے پھنکاری ''مالی تمہیں معلوم تو ہے کہ مجھے اپنے گھر میں گندگی سے کتنی نفرت ہے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ اس منحوس کتیا کو اس کے پلوں سمیت کہیں دور پھینک آتے۔ اب بے وجہ کا شور اور گند میرے لان میں ڈال دیا ہے تم نے۔ نہ جانے تم لوگوں کو گندگی سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے؟''

مالی گڑگڑایا ''بی بی جی' رات کے سمے بے زبان جانور پر ظلم اچھا نہیں لگتا تھا۔ بس تھوڑے ہی دِنوں میں یہ بچوں کو یہاں سے لے کر چلی جائے گی۔ اگر نہ گئی تو میں خود ہی تھیلے میں ڈال کر راوی کے پار چھوڑ آؤں گا تا کہ واپس نہ آ سکے۔ بس چند دن کی اجازت دے دیں۔ غریب اب اپنے معصوم پلوں کو لے کر کہاں ماری ماری پھرے گی۔ بے چارے ویسے ہی مرجائیں گے۔''

نینا کچھ سوچ کر بولی

''چلو ٹھیک ہے تمہاری خاطر مان جاتی ہوں لیکن اگر نومی نے پوچھا تو تم خود ہی انہیں جواب دینا۔ اور ہاں' خبردار جو آئندہ اس طرح کی حرکت کی۔''

نینا نے نفرت سے ٹینکی کی طرف دیکھا اور گھر کے اندر چلی گئی۔

ویسے بھی نینا کچھ دنوں سے پریشان تھی اور اپنی پریشانی کو بے وجہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھ کر بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

''Slut نے نہ جانے کتنے کُتوں سے یاری کرنے کے بعد گند میرے گھر ہی آ کر پھیلایا ہے۔'' اسی شام جب نینا نے غصے میں پاگل ہوتے ہوئے سیمی کو یہ کہا تو سیمی بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی

''نینا یار بس کرو۔ بے چاری معصوم کتیا کو اب تک بلاوجہ اتنی گالیاں دے چکی ہو۔ اس نے آخر بچے ہی دیئے ہیں کوئی جرم تو نہیں کیا۔ اور پھر آخر تم نے ہی تو اس کو اتنا سر چڑھایا کہ اس نے تمہارے' یعنی نینا زیدی کے گھر کو میٹرنٹی وارڈ بنانے کا سوچا۔ جب تم غصے میں ہوتی ہو تو انسانوں کو تو چھوڑو' جانوروں کو بھی معاف نہیں کرتیں۔ اب زیادہ پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔''

نینا کا غصہ باقی تھا۔ یہ سن کر پھٹ پڑی

''پتہ نہیں غریب ملکوں کے غریب لوگوں کو بچے پیدا کرنے کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے۔ یہاں کہیں بھی چلے جاؤ' ہر طرف بچے ہی بچے نظر آتے ہیں۔ بعد میں خود ہی یہ چھوٹے لوگ روتے ہیں کہ نوکری نہیں ملتی' کھانا نہیں ملتا۔ تو نہ کریں اتنے بچے پیدا۔ ابھی کل رات ہی میں اور نومی ایک پروگرام میں گئے ہوئے تھے جہاں ایک فرنچ ٹروپ آیا ہوا تھا۔ ایک تو یہاں کے لوگوں کو تمیز ہی نہیں کہ ایسے موقع پر کیسے خاموشی سے بیٹھنا چاہیے۔ اوپر سے وہ ان چھوٹے چھوٹے devils کو بھی ساتھ میں لے آئے تھے۔ ابھی پروگرام شروع ہی ہوا تھا کہ ایک طرف ان کے موبائل فون بجنے شروع ہوئے تو دوسری طرف ان ننھے شیطانوں نے شور کرنا شروع کر دیا۔ بھئی میرا تو دماغ ہی خراب ہو گیا۔ میری تو بس ہو گئی۔''

یہاں پہنچ کر نینا نے ہاتھ اٹھا دیئے اور بات جاری کی'' کبھی تم لندن یا فرینکفرٹ کے کسی کلاسیکل میوزک والے پروگرام میں بچوں کا سوچ سکتی ہو۔ سیمی! میں تو پچھلی مرتبہ جب آف سیزن میں سکینڈے نیویا گئی تو سڑکوں پر اور پارکس میں دن کے وقت ورکنگ ڈیز میں بچوں کو ڈھونڈتی رہ گئی۔ وہاں کے بچے نظر نہیں آئے۔ ہاں ایشینز اور افریقنز کے گندے گندے کالے کالے بچے ضرور نظر آئے۔ کوئی صاف ستھرا گورا چٹا بچہ نظر نہیں آیا۔ اور یہاں۔ مائی گاڈ ہر کونے کھدرے سے بچے چیونٹیوں کی طرح نکلتے آتے ہیں۔''

''مگر نینا بچے تو بہت خوبصورت اور معصوم ہوتے ہیں۔'' سیمی منمنائی۔

نینا پھٹ پڑی'' اوشٹ اپ سیمی۔ تم بھی ان دیسی' پینڈو' اُردو میڈیم عورتوں کی طرح ہوتی جا رہی ہو۔ ابھی کالج ہی میں ہوتی ہیں' بالوں میں تیل چپڑ چپڑ کر لگانے والیاں' گھٹیا پرفیومز استعمال کرنے والیاں کہ ان کو بھی اپنے جیسے شوہر مل جاتے ہیں۔ شلواریں پہننے والے جانور۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ یہ ان بدبودار مردوں کے ساتھ کس طرح سے سو جاتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں Deodorants استعمال نہیں کرتے۔ پاؤڈر استعمال کرتے ہیں' Talcum Powder۔ اُف اتنی دُور دُور سے ان سے پسینے کی اور نہ جانے کس کس چیز کی بُو آتی ہے۔ پتہ نہیں دیسی کالجوں کی یہ لڑکیاں ان کے ساتھ بیڈ میں کس طرح سے چلی جاتی ہیں؟۔''

نینا پر ابھی بھی نیم ہذیانی کیفیت طاری تھی'' ہاہا۔ اوہ نو۔ یاد آیا کہ یہ لڑکیاں بھی تو ویسی ہی پینڈو ہوتی ہیں۔ چلو جیسی خود ویسے بندے اور پھر ویسے ہی کرتوت۔''

سیما پیار بھرے لہجے میں بولی'' نینا یہ تم پر کیسا دورہ پڑا ہوا ہے۔ مجھے تم نارمل نہیں لگ رہیں۔ بتاؤ جان کیا بات ہے؟ میں تو تمہیں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں نا۔ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ تبھی تم اتنی فرسٹریشن میں ہو۔''

نینا یکا یک رو دی۔ آئی لائنر نینا کی بڑی بڑی خوبصورت شفاف آنکھوں کے نیچے حلقے بنانے لگا۔

سیمی نرمی سے نینا کے ملائم براؤن بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پیار بھری ہمدردی تھی۔ اس سے نینا کی کچھ ڈھارس بندھی۔ اس نے ٹشو پیپر سے اپنی سرخ ہوتی

ننھی سی تیکھی ناک پونچھی اور بڑی سی کٹورا آنکھوں سے ایک ٹک سیمی کو دیکھنے لگی۔اس کی آنکھوں میں تذبذب تھا۔

سیمی بولی" میری جان تم تو سوچ میں پڑ گئی ہو۔اپنی بچپن کی' گرامر کی سہیلی سے بھی شیئر نہیں کرو گی؟"

نینا ہچکچائی" نہیں سیمی ایسی کوئی بات نہیں۔بس سوچ رہی ہوں کہ تو میری بات کو سمجھ بھی پائے گی یا نہیں۔ایک تو تُو دیسی لڑکیوں کی طرح سوچنے لگتی ہے۔اسی بات سے ڈرتی ہوں۔"

اس پر سیمی نے اس کی ہمت بندھائی" یار نینا کم آن۔جو بوجھ بھی تیرے دل پر ہے مجھ سے شیئر کر لے۔میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیری طرح سوچنے کی کوشش کروں گی۔"

اس پر نینا بول پڑی" سیمی وہ سب کچھ اتنی جلدی ہو رہا ہے جو ابھی نہیں ہونا چاہیے۔ میری اور نومی کی شادی کو ابھی صرف دو سال ہی ہوئے ہیں۔ ہمارا تو انڈرسٹینڈنگ والا ایشو بھی نہیں۔نومی کو تو تُو تبھی سے جانتی ہے جب بالز میں میرا اور اس کا Couple بنا کرتا تھا۔وہ بہت سویٹ ہے لیکن سوچتا Typical پاکستانی مردوں کی طرح ہے۔"

"اب بک بھی دے یار۔"

" سیمی میں کل ڈاکٹر نصرت کے پاس گئی تھی۔میری روٹین میں فرق آ گیا تھا۔شروع میں سوچا کہ شائد کوئی میڈیکل Reason ہو گا۔لیکن جب تین مہینے سے اوپر ہو گئے تو ڈاکٹر کے پاس گئی۔اس نے کہا اچھی خبر ہے۔۔۔بُل شِٹ۔۔۔نومی کو سمجھایا بھی تھا کہ احتیاط کیا کرے۔ مرد تو چاہتے ہیں کہ ساری احتیاطیں عورتیں ہی کریں۔میری تو پہلے بھی روٹین ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ سر میں درد رہنے لگا تھا۔ایک مرتبہ تیرے سے مشورہ بھی کیا تھا۔Pill تو مجھ سے لیا نہیں جاتا۔ ایویں کوئی نقصان نہ ہو جائے۔لیکن جب بہت ہو گئی تو میں نے نومی سے کہہ دیا کہ اپنے آپ کو خود ہی Protect کیا کرے۔یہ مرد بھی نہ جانے کس مٹی سے بنے ہیں۔جب ایسی کوئی بات ہوتی ہے تو کتنے Selfish ہو جاتے ہیں۔اپنی Satisfaction چاہتے ہیں۔چاہے عورت کا کچھ بھی ہو جائے۔انہیں عورت کی تو کوئی فکر نہیں ہوتی۔اب پتہ نہیں کہاں پر کس سے غلطی ہوئی۔میں نے تو شروع ہی میں نومی سے کہہ دیا تھا کہ مجھے ابھی سے baby نہیں کرنا۔اتنی مشکل سے اپنا فگر

Maintain کیا ہوا ہے۔خراب ہو جائے گا۔ پھر ابھی تو شادی کے شروع کے دِنوں کا ہینگ اوور بھی باقی ہے۔ایویں ہی اپنے اوپر بوجھ ڈال لوں۔''

یسی تاسف سے سر ہلانے لگی۔اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرائے۔ کچھ دیر توقف کر کے بولی ''نینا' تو یہ بات تھی۔لگتا ہے کہ شائد وقت کچھ اوپر ہو گیا ہے۔تُو نے نومی سے بات کی ہے؟''

''کیا میں تجھے اتنی پاگل نظر آتی ہوں۔نومی کو بتا کر میں نے کیا مرنا ہے۔اسے بتا دیا تو میرے پیچھے پڑ جائے گا۔ وہی نیچر میں Interfere نہ کرنے والی بکواس۔ نہ جانے اسے بچوں سے اتنا پیار کیوں ہے۔شائد بچپن کی محرومیاں ہیں۔ ماں نے اتنا دبا کے جو رکھا تھا بے چارے کو۔ اس Cough machine نے ہمیشہ نومی کو بیچارا بنا کے رکھا۔ کبھی کبھی مجھے نومی پر اتنا ترس آتا ہے۔ پیار کرنا اور بات ہے اور dominate کرنا اور۔ نومی بچے کے لیے بہت شور کرے گا۔ پہلے ہی اتنی مشکل سے مانا تھا کہ شروع کے سالوں میں baby نہیں مانگے گا۔ وہ تو شروع میں کہتا تھا Darling i want to be a young dad۔'' نینا منہ بنا کر بولتی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر بھرائی آواز میں بولی ''یسی بتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں ابھی سے ماں ماں لگنا نہیں چاہتی۔ میں فریش اور ینگ لگنا چاہتی ہوں۔ابھی ویک اینڈ پر فارم ہاؤس والی پارٹی میں نومی کا وہی cute سا دوست شیری دوسرے ہی پیگ پر جیسے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے Appreciate کر رہا تھا کہ میں ابھی بھی کالج والی نینا لگتی ہوں' تو میں اس Feeling کو مِس نہیں کرنا چاہتی۔ جب نومی کے دوست میری تعریف کرتے ہیں تو وہ بھی تو اتنا خوش ہوتا ہے۔ان کی کالی کالی' چھوٹی چھوٹی چوہیا جیسی Acne والی بیویاں تو بس اس طرح جل بُھن جاتی ہیں کہ مزہ آ جاتا ہے۔'' یہاں پہنچ کر نینا نے کچھ سوچ کر چٹخارہ لیا۔ پھر بولی ''تجھے تو پتہ ہے کہ یسی میں آگے ہی دھوپ میں نہیں نکلتی کہ رنگ کالا نہ ہو جائے جم جا جا کر اتنی مشکل سے فگر Maintain کیا ہوا ہے۔ اب کیا اماں جان بن جاؤں؟ زندگی کو بے بی Cot میں سُلا دوں؟ I dont want to become my own past۔نہ بھئی نہ۔ یہ نہیں ہو گا مجھ سے۔'' نینا کی آواز میں لاچاری تھی۔

''دیکھ نینا میں نے وعدہ کیا تھا کہ تیری طرح سوچنے کی کوشش کروں گی۔ مجھے پتہ ہے

کہ تجھے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔مگر لگتا ہے کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"میں اسٹیٹس چلی جاتی ہوں۔وہاں ٹریٹمنٹ کروالوں گی۔ویسے بھی وہاں عائشہ بہت دِنوں سے بُلا رہی ہے۔اسی کے بہانے چلی جاؤں گی۔"

"لیکن شائد وہاں کسی Complication کے بغیر یہ سب Illegal ہے۔"

"ہاں۔لیکن ہر اسٹیٹ کے لاز مختلف ہیں۔پر میں پوچھ کر ہی جاؤں گی۔"

"تُو یہاں سے کچھ کیوں نہیں کروالیتی؟"

"تُو چاہتی ہے کہ میں کسی صفیہ کلینک ٹائپ میں داخل ہو جاؤں تاکہ میری لاش یہ سویپر اس طرح لے جائیں جیسے جھاڑو میں چھپکلی اُٹھاتے ہیں؟۔"

"یار میرا مطلب ہے کہ شائد ڈرگز سے بات بن جائے۔ڈیفنس میں ایک بڑا سمارٹ ینگ ڈاکٹر America سے گائنی میں کچھ کر کے آیا ہے۔بہت تعریف سنی ہے اس کی۔اس سے مشورہ لے لے۔"

"سیمی یہ treatment بھی اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔اصل بات تو نومی کو ہینڈل کرنا ہے۔"

"تُو اسے کیسے ہینڈل کرے گی؟"

"یہ میرے اوپر چھوڑ دے۔کچھ کرتی ہوں۔"

اٹھتے اٹھتے سیمی بیٹھ گئی۔کچھ دیر سوچتی رہی پھر ہچکچاتے ہوئے بولی"نینا اگر تُو بُرا نہ مانے تو میں کہوں گی کہ پھر دوبارہ سوچ لے۔بچے motherhood کی بہت خوبصورت feeling دیتے ہیں۔یہ ان سے پوچھ جن کے بچے نہیں۔اور میں نے تو سنا ہے کہ اگر Procedure کے دوران کوئی مسئلہ ہو جائے تو دوبارہ baby کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ایسا نہ ہو کہ تُو بعد میں افسوس کرے۔"نینا کچھ دیر اُسے گھورتی رہی اور پھر غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

سیمی کے جانے کے بعد نینا اپنی خواب گاہ میں آ کر ٹہلنے لگی۔وہ بلاشبہ ایک پُرکشش سراپے کی مالک تھی۔اس کا شاندار فگر' لمبا قد' براؤن نرم بال' نازک نین نقش' جھالر سی پلکوں میں قید

بڑی سیاہ آنکھیں، مخروطی گوری انگلیاں اور خوبصورت پیر اس کو کسی بھی غیر ملکی رسالے کی Cover model کے لیے موزوں بناتے تھے۔ اس کی پُر وقار چال میں ایک تمکنت تھی، ایک غرور تھا۔ اور وہ اپنا غرور ماتا کی پرچھائیوں میں توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

نومی کو منانا نینا کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ باپ بننے کی خبر سن کر اس پر ایک پُر مسرت جوش طاری ہو گیا۔ وہ نینا کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ نومی کی دیوانگی دیکھ کر نینا کی اس سے کئی جھڑپیں ہوئیں۔ نینا نے ہر طریقہ آزمالیا۔ ضد کر کے، روٹھ کر اور لڑائی کر کے دیکھ لیا۔ جب نینا نے اپنے امی کے پاس چلے جانے کی دھمکی دے دی تو نومی کے ارادوں میں پہلی دراڑ پڑی۔

اور پھر یہ دراڑ بڑھتی گئی۔

بالآخر نومی نے نینا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے ایک ماہر گائنا کالوجسٹ کا پتہ کروایا۔

اُن کی بات سن کر اور چیک اپ کے بعد گائنا کالوجسٹ کے سنجیدہ چہرے پر سنجیدگی کے سائے مزید گہرے ہو گئے۔ اُس نے مستقبل کی کسی پیچیدگی کے پیش نظر دونوں کو ارادہ بدلنے کا مشورہ دیا۔ اب اس کا ابورشن (Abortion) کے سوا کوئی اور حل نہ تھا۔

کلینک سے باہر آ کر نومی نے آخری مرتبہ التجائی انداز میں نینا کو سمجھایا۔ مگر سب التجائیں بے سُود ثابت ہوئی۔ تریاہٹ اٹل ٹھہری۔

جس روز نینا کو کلینک میں داخل کرایا گیا، اس روز نینا کے گھر کے لان میں کتیا ستمبر کے اواخر کی سہ پہر کو اپنے دونوں بچوں کو گھاس پر لٹائے ان سے کھیل رہی تھی۔ پلوں کے جسموں کا ماس اب سفید بالوں سے بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ مندی آنکھوں کی جگہ چمکتی آنکھوں نے لے لی تھی۔ دونوں پلے لان میں لوٹ پوٹ ہوتے تھے اور اپنی ماں سے اٹھکیلیاں کرتے تھے۔ ماں، آنکھیں موندے، ٹھنڈی ہوتی ہوا کے مزے لیتی تھی اور بیچ بیچ میں دل کی تسلی کے لیے ایک آنکھ نیم وا کر کے بچوں کو دیکھ لیتی تھی۔ پھر مطمئن ہو کر دوبارہ آنکھیں مُوند لیتی۔ بوڑھا مالی کیاریوں میں کام کرتے کرتے رُک کر پلوں کو کھیلتا دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔

اس سے بیگم صاحبہ نے کئی روز سے کتیا اور پلوں کے بارے میں استفسار نہ کیا تھا۔ بلکہ

چند ایک مرتبہ اُن کو لان میں کھیلتا دیکھ کر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ پچھلے چند روز سے کچھ اُلجھی اُلجھی نظر آتی تھیں۔ اُن کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا۔ صاحب اور بیگم صاحبہ نے کئی شاموں سے لان میں اکٹھے بیٹھ کر چائے بھی نہ پی تھی اور نہ ہی اکٹھے کہیں باہر نکلے تھے۔

ملازمہ نے ایک روز اُسے راز داری سے بتایا تھا کہ صاحب اور بیگم صاحبہ میں لڑائیاں ہو رہی ہیں' بلکہ ایک رات تو دونوں علیحدہ بھی سوئے۔ پھر ایک روز ملازمہ نے اُن کی صلح کی خبر اس مایوسی سے سنائی کہ ڈرامہ جلد ختم ہو گیا تھا۔

ایک روز بتایا گیا کہ بیگم صاحبہ دو تین روز کے لیے دبئی جا رہی ہیں۔ جب صاحب' بیگم صاحبہ کو چھوڑنے ائیر پورٹ کا کہہ کر گئے تو ڈرائیور کو گھر ہی چھوڑ گئے۔ وہ دونوں اُداس اور افسردہ دکھائی دیتے تھے۔

صاحب بی بی کو چھوڑ کر بُجھے بُجھے گھر لوٹے۔ آتے ہی وہ بیڈ روم میں چلے گئے۔ بس کچھ دیر بعد ملازم برف کی ٹکڑیاں ان کے کمرے میں لے جاتا دیکھا گیا۔

اگلے روز اُداسی کی سُرمئی شال لپیٹے گزر گئے۔ صاحب بھی زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہے۔

تیسری صبح صاحب باورچی کو بتا گئے کہ بیگم صاحبہ واپس آ رہی ہیں اور ان کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے پرہیزی کھانا بنا رکھے۔

اسی دوپہر کو جب سفید بالوں کو اُون میں بُنی روسی کتیا اپنے بچوں کے ساتھ لان میں اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور وہ دونوں لپک لپک کر ماں کو دبوچتے تھے تو کوٹھی کے گیٹ پر کار کا ہارن بجا۔ گیٹ کھلنے پر صاحب کی سیاہ چمچماتی کار پورچ میں آ کر رکی۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر اترے اور بڑھ کر دوسری فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

نینا نقاہت سے گاڑی سے اتری۔ اس نے سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی۔ چہرے کی شاداب سفید رنگت زرد ہو رہی تھی اور آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ رہے تھے۔ اُس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ پہلے مالی کو دیکھا پھر ملازمہ اور باورچی کے سلاموں کا سر ہلا کر جواب دیا۔

اس کے انداز میں تھکاوٹ تھی۔ وہ چلتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

جب وہ گھر کے دروازے کی جانب بڑھی تو اس کی نظر بے اختیار لان میں جا پڑی۔ کتیا اور اس کے پلے آپس کی پیار بھری اٹھکیلیاں چھوڑ کر اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی نگاہیں کتیا کی نظروں سے دوچار ہوئیں۔ کتیا کی آنکھوں میں فخر بھری ممتا تھی۔

پھر ایک دم اسے یوں لگا جیسے کتیا کی نظروں میں ممتا کی جگہ اس کے لیے گہرا طنز ابھر آیا ہو۔

نینا کی نظریں بے اختیار جھک گئیں اور وہ نڈھال ہو کر قریبی کرسی پر بیٹھتی چلی گئی۔

سامنے کتیا پھر سے اپنے بچوں سے ممتا بھرا لاڈ کرنے لگی۔

چاچا عزت

''عزت چاچا ٹیک ای کہتا تا۔ پنجابی بے حوصلہ قبیلہ ہے۔'' وہ کہتا تا۔ ''ڈھگا''۔

غیرت خان نے بندوق کی نالی میں دیکھا۔ نالی کی ہموار سُرنگ کی دوسری طرف روشنی کو دیکھ کر تسلی کی۔ اُس کے اندر پھونک ماری۔ پھونک سے تھوڑی سی گرد اڑی۔ وہ نالی کو دونوں گھٹنوں کے بیچ میں دبا کر خشک کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔

''اگر بے حوصلہ نہ ہوتا تو ہر غیر قوم کے سامنے جھک نہ جاتا'' اُس نے نسوار کچے فرش پر تھو کی اور آستین سے ہونٹوں کو پونچھ لیا۔

''آج بوہت غصہ کرتا ہے۔ بوہت خفا ہے۔'' دلاور خان نے داڑھی کھجائی۔

''اب بولنا خلاص کرنے کو ہے اور جہاد شروع کرنے کو۔ اللہ قبول کرے۔'' غیرت خان نے انکھیوں سے مٹی کی دیوار پر پیوستہ پھٹے پر دھرے ٹی وی کو دیکھا اور نالی کو رگڑنا جاری رکھا۔

''دلاور خانا۔ کافر کو تو مانی ہے۔ پر منافق کو نئیں۔ پھر ایسا منافق جو مسلمان کی صف میں شامل ہو کے پیٹھ سے حملہ کرے۔ مرد کا بچہ ہو تو سامنے سے آئے۔ وہ دیکھ۔'' اس نے سامنے

اشارہ کیا۔

ٹی وی پر ایک باریش جوان لہک لہک کر سازوں کے ساتھ نعت پڑھ رہا تھا۔

''بس ایسا منافق کو غیرت خان سیدھا جہنم بھیجے گا۔ ڈائریکٹ پارسل۔ بغیر ٹکٹ۔ او میراثی لوگ اگر گانا بجا کر رسول کا نام بول کر اسے خفا ہی کرنے کا ہے تو چھوڑ دو یہ منافقت اور صاف دشمن کے خبیث بچوں کے ساتھ دوستی بناؤ۔ ہونٹوں پر سرخی جماؤ۔ زنانوں کی طرح گھنگھرو چڑھاؤ۔ خوب ناچو۔ اور رات ان کو خوب مزے کراؤ۔''

غصے سے غیرت خان کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں اور ہاتھوں کی حرکت میں تیزی آ گئی۔

''ام نے بھی اللہ کے حُکم سے یہ بندوق کی نالی اِن خبیث کے بچوں کے منہ سے نہ نکالی تو پشتون نہیں۔''

تھوک کے چھینٹے اُس کے ہونٹوں سے اُچھل پڑے۔

دلاور خان ہنس پڑا۔

''غیرت خانا۔ داڑھی مونچھ تو آنے دے۔ اتنا خفا ہونا بھی ٹھیک نہیں۔ ابی تو ام لوگ تیری شادی بنانے کو ہے۔''

''امارے سینے میں اتنا بڑا داڑھی ہے کہ کسی مولوی صاحب کے بھی نہیں۔ پھر عزت چاچا نے کان میں اذان دے کر مسلمان کیا۔ اچھا کیا۔ بوہت مہربانی کیا۔ اب جوان ہوا تو جہاد سے شادی کر لیا۔ غیرت خان کے لیے یہی بوہت ہے۔'' غیرت خان نے اپنے سینے کو ٹھونکا۔

''عزت خان کو شہادت مبارک ہوئے دو سال ہونے کو ہے۔ پر تو ہر دم اُسے یاد کرتا ہے۔''

غیرت خان نے بات کاٹ دی۔

''اس نے اِس کافر کو مسلمان بنایا۔ پھر قرآن پڑھایا۔ بندوق پکڑنا سکھایا۔ بوہت بڑا احسان کیا۔ انسان کا پرکھ بتایا۔ اور پھر جنت کا رستہ پر خود تو چلا گیا پر سچا رستہ دکھا گیا۔''

اس پر دلاور خان بولا۔ ''ہاں صحیح بولتا ہے تُو۔ پولیس نے دو گھڑی سانس بھرنے بھی نہ

دیا۔ کُتے کے بچوں نے گولی سیدھا پیٹھ میں اُتار دیا۔ مرد کے بچے ہوتے تو ٹرک چھوڑ کر جاتے چاچا کی پیٹھ میں گولی نہ مارتے۔"

غیرت خان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اب چاچا جنت سے امارے لیے دعا کرتا ہوگا۔ بوہت نیکی کمایا۔ سفید خنزیروں کے وطن میں خُوب بھر بھر کے نیند کا دوائی بھیجا اور جہاد کے لیے پیسہ کمایا۔ شہید بولتا تا کہ ان سفید خنزیروں کو اتنا دوائی پلاؤ کہ مرے کُتے کے مافق ہو جائیں۔ اللہ ہی اس کی نیکی کا اجر دے گا۔ نہ دن دیکھا نہ رات۔ لنڈی کوتل سے سہراب گوٹھ تک محنت کیا۔ دماغ ایسا چلتا تھا کہ گاڑی کے اندر ایسا ایسا تریکے سے دوائی چھپایا کہ ام کو حیران کر گیا۔"

دلاور خان نے لمبی سانس بھری۔ "اور اب جنت میں اکیلا مزے کرتا ہے۔"

اب ٹی وی پر ایک سیاسی جماعت کے وزیر کی تقریر آ رہی تھی۔ غیرت خان نے اُدھر دیکھا اور حقارت سے بولا "کمزور۔ عزت چاچا بولتا تا کہ سہراب گوٹھ کے اُدھر کافر کے بچوں کے ہاتھ میں بندوق آیا تو پشتون کے گردن کو آ گیا۔ پہلے تو تھپڑ کھا کے ماموں کو یاد کرنے کا تھا۔ اِدھر ام پورا دُنیا ہضم کر جاتا ہے اور ٹھنڈا پانی پی کر اللہ کا شکر کرتا ہے۔ اُدھر یہ ایک بوٹی کو چُوس چُوس کر چھوڑ دیتا ہے۔ اِن کافروں کو بھی دیکھ لے گا۔"

اس کی سوئی قومیت پر اٹکی ہوئی تھی۔

اب غیرت خان نے قریب پڑی میلی کچیلی پتیلی میں تیرتے کثیف تیل میں کپڑا بھگو کر اُسے نچوڑا اور نالی پر رگڑنے لگا۔

گوبر اور مٹی کی لپائی والے کچے کمرے میں ایک جانب کچی لکڑی کی کھڑکی تھی اور دوسری جانب دروازہ جس پر لکڑی کے دو تختے جھول رہے تھے۔ دیوار پر پھٹے کے تختے کے اوپر قرآن پاک، جائے نماز اور تسبیح دھری تھی۔ دوسری دیوار پر پیوست ایک پھٹے پر ٹی وی رکھا تھا۔

"ام جانتا اے کہ ٹی وی حرام اے۔ شیطانی ڈبہ اے۔ مگر عزت چاچا بولتا تا کہ دُشمن پر نظر رکھنا ضروری اے۔ اس واسطے حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ تو ام اس آلے کے ذریعے دُشمن پر نظر رکھے اے۔ جب دُشمن کمزور پڑے گا ام اُس پر حملہ کر دے گا۔ اِس پشتون وطن کو کافروں سے

آزاد بنائے گا اور اللہ کا حکومت لائے گا۔ پھر اٹک سے اُدھر کافر مُلک سے جنگ کرے گا۔''

اس نے ایک مہمان کو توجیح پیش کی تھی۔

ایک کونے میں پلاسٹک کے فریم میں شیشہ تھا جس کے نیچے تیل کی بوتل اور کنگھا رکھا تھا۔ کچی زمین پر ایک طرف گول تکئے کے گرد چٹائی کو لپیٹ کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

دوسرے کونے میں بندوق کی نالیاں ایک ترتیب میں ڈھیر کر دی گئی تھیں۔

اتنے میں ظہر کی اذان ہوگئی۔ غیرت خان اور دلاور خان کپڑے جھاڑتے اور سر پر ٹوپیاں سنبھالتے کمرے سے باہر نکل کر گلی میں آ گئے۔ گلی کے بیچ نالی میں سیاہ سیال میں پاخانہ بہتا آ رہا تھا۔

ایک کونے میں بچے دیوار کے ساتھ کُرسی کی وکٹ کو کپڑوں کے ٹکڑوں سے بندھی بنی گیند سے نشانہ بنا رہے تھے۔ کُرسی کے ایک پائے کی جگہ اینٹیں رکھ دی گئی تھیں اور پائے سے بیٹ کا کام لیا جا رہا تھا۔ ایک بچے نے گیند کو شاٹ لگائی تو وہ ہوا میں تیر کی سی تیزی سے نکلی۔ غیرت خان نے لپک کر اُسے ہوا سے اُچک لیا۔ بچوں نے شور مچا دیا۔ ''کیچ کیچ۔'' اس پر غیرت خان تو ہونٹوں کو دانتوں میں دباتے ہوئے بالر کے انداز میں گیند کرائی۔ وہ پار کر کرتی کُرسی کو گراتی چلی گئی۔

غیرت خان کے چہرے پر دن میں پہلی مُسکراہٹ آئی۔

''بچہ ای تو اے۔ اٹھارہ برس کیا عُمر ہوتی ہے۔'' دلاور خان نے سوچا۔

ابھی وہ گلی مُڑے ہی تھے کہ جیسے غیرت خان کو کچھ یاد سا آیا اور وہ واپس مُڑا۔

''غیرت خان اُدھر پشاور میں تو تجھے کرکٹ میں داخل کر لیا تا نا پھر تُو چھوڑ آیا۔ کچھ کرکٹ ورکٹ کھیل کر غصہ نکالا کرتا پر تو اِدھر آ گیا۔''

غیرت خان ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''پھر بولنے کا نہیں۔ اللہ خفا ہوتا اے۔ جہاد افضل ترین ہے۔''

''خیرا اے خانا؟'' دلاور خان نے پوچھا۔

''خیرا ای نئیں۔ کمرے کا دروازہ کُھلا چھوڑ دیا۔''

''کمرے میں رکھا ای کیا اے۔'' دلاور خان کو واپس لوٹنا ناگوار گزر رہا تھا۔ اس پر غیرت خان چلتے چلتے رُک گیا اور سرگوشی کی۔

''اللہ سے مافی مانگنے کا اے۔ سارا دولت وہیں تو ہے۔ سارا جہاد کا مال اے۔''

دلاور خان نے سر جھکا لیا۔

نماز سے واپسی پر کچے مٹی کے رنگے مکانوں کے بیچ گلی میں چلتے آتے ہوئے غیرت خان نے کانوں کو چھوتے ہوئے دلاور خان سے کہا۔

''شکر اے اللہ کا پشتون کو مسلمان بنایا۔ ورنہ یہاں اللہ کا بے عزتی خراب ہوتا۔ چاچا عزت بوہت عقل والا اور سچا تھا۔ سندھی کے منہ پر اُسے بُزدل کہتا تھا۔ بولتا تا کہ وہ قوم ای کیا جو خود تو سارا دن چائے خانوں میں بیٹھے اور زنانے سے کھیتوں میں کام کرائے۔ اللہ کا اتنا زمین ضائع کر کے ناشکری کرتا اے۔''

دلاور خان نے لقمہ دیا۔

''پر بلوچ کی تعریف کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ اپنے زنانے کو گھر دبھا تا اے اور شرم کھاتا اے۔''

غیرت خان نے اُس کا ہاتھ تھاما اور دبا کر سرگوشی کی۔

''دلاور خانا بکری کا دودھ پیا کر۔ بھولتا اے کہ وہ کہتا تا کہ یہ قبیلہ شرم تو کھاتا اے پر پیسے پر بک بی جاتا اے۔''

اس پر دونوں متفق ہو گئے کہ اُن کا تعلق اللہ کے خاص قبیلے سے ہے اور یہ کہ دونوں ملکوں کے مسلمان مِل کر ایک آزاد وطن بنائیں گے اور دونوں کافر حکومتوں سے جنگ بنائیں گے۔

واپس آ کر کمرے میں جب دونوں نے ٹی وی لگایا تو سامنے کرکٹ کا فائنل میچ آ رہا تھا۔

بھارت نے پاکستان کو جیتنے کے لیے ایک بڑا اسکور دیا تھا۔

غیرت خان نے نالی پر کپڑا رگڑتے ہوئے کن انکھیوں سے میچ کو دیکھا اور طنزیہ لہجے

میں دلاور خان سے بولا۔

''کافر کا مقابلہ کافر سے۔''

اور اس نے سر جھکا لیا۔ بندوق کی نالی پر اس کے ہاتھ حرکت کرنے لگے۔ دونوں خاموش ہو گئے اور کمرے میں کرکٹ کی انگریزی کمنٹری کی آواز گونجنے لگی۔

''مولوی صاحب فرماتا اے کہ جنت کا زُبان عربی ہوگا اور جہنم کا انگریزی۔''

تھوڑی دیر بعد دلاور خان نے غیرت خان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''دُشمن کی چال سمجھنے کے لیے اس کا زُبان آنا ضروری اے۔'' غیرت خان نے گویا اسے سمجھایا۔

کچی دیوار کی درز میں سے کوڑھ کرلی نے ننھا سا سر نکالا اور دیوار پر رینگتے ایک مکوڑے کو نگل کر اپنا سر اندر کر لیا۔

فائنل میچ سنسنی خیز لمحات میں داخل ہو گیا۔

غیرت خان کے ہاتھوں میں سستی اُتر آئی۔ اُس کی آنکھیں یوں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں جیسی رات کو جیپ کی روشنی میں چندھیا کر شکار کی آنکھیں جم جاتی ہیں اور وہ اپنی جگہ پر بُت ہو جاتا ہے۔

عصر کی اذان ہوئی تو پاکستان کو جیتنے کے لیے چون گیندوں پر ستر رن چاہئیں تھے اور اُس کے چھ وکٹ باقی تھے۔

''جلدی اُٹھو خانا۔ شیطانی ڈبہ اے۔ اللہ سے غافل کرتا اے۔''

جب دلاور خان بولا تو غیرت خان خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اتنے میں پاکستان کا ایک کھلاڑی اور آؤٹ ہو گیا۔

رستے میں غیرت خان نے اُس سے کرکٹ میچ پر اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''خنزیر کا بچہ بکا ہوا اے۔''

''دونوں طرف خنزیر اے۔ کون سا خنزیر؟'' دلاور خان نے پوچھا۔

''ختنے والا خنزیر۔'' غیرت خان نے غصے سے کہا۔

''خفا کیوں ہوتا اے۔ تجھے کیا فرق پڑتا اے۔'' دلاور خان نے اُسے سمجھایا۔
اس پر دونوں سر جھکائے مسجد میں دایاں پیر پہلے رکھتے ہوئے داخل ہو گئے۔
واپسی پر دلاور خان نے غیرت خان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا
''تم چلو۔ ام ابھی ایک فرض ادا کر کے آتا اے۔''
جب غیرت خان واپس کمرے میں لوٹا تو پاکستان کو جیتنے کے لیے چوبیس گیندوں پر تیس رن چاہئیں تھے۔
غیرت خان کی نظریں ٹی وی یوں جم گئیں جیسے موم بتی کی موم پگھلتے ہوئے اُسی پر جم جاتی ہے۔
چند لمحے گلی کی نالی میں بہہ گئے۔
کچھ دیر میں دلاور خان جب کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو غیرت خان ہاتھ میں بندوق کی نالی تھامے منہ کھولے ٹی وی کی اسکرین پر گھور رہا تھا۔ نالی سے تیل ٹپک ٹپک کر اُس کی قمیض میں جذب ہو رہا تھا مگر وہ اس سے بے نیاز تھا۔
دلاور خان کچھ بولنے لگا تو غیرت خان نے اسکرین پر ٹکٹکی لگائے ہی اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔
اُس نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ پاکستان کو فائنل جیتنے کے لیے آخری دو گیندوں پر چار رن چاہیں تھے اور اس کا آخری کھلاڑی کریز پر تھا۔
بھارتی بالر اسٹارٹ لے چکا۔ دلاور خان غیرت خان کے اور نزدیک ہوا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
غیرت خان زیرِ لب تلاوت کر رہا تھا۔
اتنے میں باؤلر نے یارکر پھینکا جو بلے کو چھو کر تر چھا ہوا اور وکٹ کیپر کے قریب سے ہوتا ہوا باؤنڈری لائن عبور کر گیا۔
اس کے ساتھ ہی غیرت خان نے نعرہ بلند کیا اور دلاور خان کے گلے لگ گیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔

''دلاور خانا۔ ام نے جیت بنالی۔ ام نے جیت بنالی۔''

اور دلاور خان کبھی بندوق کی نالیوں کو دیکھتا تھا اور کبھی ٹی وی کو دیکھتے ہوئے اپنی گردن پر غیرت خان کی گرم سانسوں کو محسوس کرتے ہوئے اُس کے نعروں کو سنتا تھا اور اپنے آپ کو ہوتق محسوس کرتا تھا۔

ایک لفظ

ایک لفظ، فقط ایک لفظ کسی انسان کی زندگی کا رُخ اور سوچ کے زاویے کیسے یکسر بدل سکتا ہے اس کا ادراک مجھے اُسی روز ہوا۔

یقیناً ایک انسان کی زندگی دلچسپ اور غیر متوقع واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔

میں ایک اچھے درجے کی فیکٹری میں ملازم تھا۔ فیکٹری میں ثقافتی دستکاری کی اشیاء برآمد کے لیے تیار ہوتی تھیں۔ جہاں ایک جانب شیشم اور اخروٹ کی لکڑی کی رنگین پیڑھیاں تیار ہو رہی ہوتیں وہیں پر دوسری جانب مغلئی انداز کی دیوار گیر قالین بافی کا کام جاری ہوتا۔ ایک گوشہ پیتل کی منقش چمکتی صراحیوں کے لیے مخصوص تھا تو دوسری گوشے میں چاکوں پر مٹی کے پرانی طرز کے برتن تیار ہوتے تھے۔ سنگ مرمر کی اشیاء البتہ باہر تیار ہوتیں اور فیکٹری کے گوداموں میں ڈھیر کر دی جاتیں جہاں سے وہ بڑے بڑے کنٹینروں میں بھر کر روانہ کر دی جاتیں۔

میری ڈیوٹی وہاں بطور سپروائزر تھی۔ فیکٹری کا مالک ایک مہربان شخص تھا۔

اپنی ملازمت کے کچھ ہی عرصے میں، میں اس کے کافی قریب آ گیا تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ بلا شک و شبہ میں بھی اپنے فرائض پوری تندہی سے سرانجام دینے کی کوشش کرتا

تھا۔ ویسے بھی میرے اوپر سوائے ایک بوڑھی ماں کے کوئی اور ذمہ داری نہ تھی۔ دوست یاروں کا مجھے کوئی خاص چسکا نہ تھا' البتہ کام کا لپکا ضرور تھا۔ میں اُن لوگوں میں سے تھا جو اپنے کام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ محنت کا یہی جذبہ غالباً مجھے میرے مالک کے قریب لے آیا تھا۔

اسی دوران مالک کی ماں فوت ہو گئی تو میں باقاعدہ افسوس کے لیے اپنی ماں کو اُن کے گھر لے گیا۔ وہاں تجہیز و تکفین کا کام جاری تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مالک کے ہاں بیٹا نہیں' سو اُس موقع پر میں نے پورے خلوص سے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ویسے بھی ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ بھلے آپ دوسروں کی خوشیوں میں شریک نہ ہو پائیں لیکن غم بانٹنے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ میری ماں' جو مالک کو میرا محسن جانتی تھی' بھی اُن تمام دِنوں میرے ساتھ وہاں جاتی رہی۔

بعد میں کئی دِنوں تک ماں ان کے گُن گاتی رہی۔ وہ کہتی تھی کہ اپنی تمام تر امارت کے باوجود ایسے نجیب' شریف اور سادہ لوگ ایک ناپید ہوتی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف ان کے اندازِ زندگی' کھانے پینے اور عادات و اطوار کی سادگی کی قائل ہو گئی تھی بلکہ جذبہء ہمدردی کی بھی تعریف کرتی تھی۔ خیر اُن کے جذبہء ہمدردی کی تو وہ تب ہی سے قائل تھی جب میرے والد کی اچانک وفات پر مالک نے اُن سے دُور کے ایک تعلق کی وجہ سے مجھے ملازم رکھ لیا تھا۔ اب جو ماں اُن کے گھر میں جھانک کر آئی تو جہاں گھریلو ملازمین اور اُن کے بچوں کے ساتھ شفیقانہ سلوک نے اُس کے دِل کو چھوا وہیں پر وہ مالک کی بیوی کی مرحوم بھانجی کے لڑکے' جو اپنی ٹانگ میں نقص کے باوجود بہت پیارا بچہ تھا' کے ساتھ اُن کے محبت آمیز سلوک سے بھی بہت متاثر ہوئی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ زندگی غیر متوقع واقعات کا تسلسل ہے۔

سو اپنی ماں کی وفات کے چند ماہ بعد میرے مالک نے ایک روز مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور چائے پر میری والدہ کی بہت تعریف کرتے ہوئے اصرار کیا کہ میں کسی روز شام کو چائے پر اُن کو مالک کے ہاں لیکر جاؤں۔ میں ابھی اس عزت افزائی کو ہضم بھی نہ کر پایا تھا کہ اٹھتے اٹھتے مالک نے مجھے آگاہ کیا کہ اُس نے فیکٹری کی ایک برانچ پہاڑی علاقوں میں کھولنے کا فیصلہ کیا ہے جہاں فقط سنگِ مرمر کی صراحیاں' چوکیاں' سجاوٹ کے نمونے' مجسمے اور فوارے وغیرہ بنائے جائیں گے۔ کچھ دیر توقف کر کے مالک نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا' آنکھوں میں غور سے دیکھ کر مسکرایا اور

بتایا کہ مجھے ترقی دے کر منیجر بنا دیا گیا ہے اور یہ کہ اُس پہاڑی فیکٹری کے بنیادی انتظامی امور میں ہی سنبھالوں گا۔

عجیب بات ہے کہ خوشیوں اور غموں کے ادوار ہوتے ہیں۔غموں کے دور میں ہر دوسری خبر غمگین کرنے والی ہوتی ہے جبکہ خوشیوں کے دور میں غموں کے جانور بھی خوشیوں کا دودھ دینے لگتے ہیں۔

ابھی میں ان خوشگوار خبروں کے کیف آگیں سرور میں تھا کہ چائے سے واپسی پر ماں نے مسرت سے ہکلاتے ہوئے سرگوشی میں بتایا کہ اُن لوگوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے میرے رشتے کی بات کی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اُن کے گھر بار ہا جانے کے باوجود میں نے کبھی اُن کے گھر کی خواتین میں دلچسپی نہ لی تھی۔ چند ایک مرتبہ سرسری طور پر اُن کی بیٹی کو عزت کی نظر سے ضرور دیکھا تھا۔ وہ یقیناً ایک قبول صورت لڑکی تھی۔

زندگی کا ایک اور فلسفہ بھی مجھے شادی کے بعد ہی سمجھ میں آیا۔ میں بسا اوقات حیران ہوتا تھا کہ زیادہ تر اچھے خاصے خوش شکل لڑکے واجبی شکل کی لڑکیوں پر کیونکر اپنا دِل ہار بیٹھتے ہیں اور حسین لڑکیوں کو قبول صورت لڑکوں میں کیا نظر آتا ہے۔اس کی وجہ سوائے محبت کے کچھ اور نہیں۔ محبت کی رنگین عینک کے دوسری جانب ہر شے خوبصورت نظر آتی ہے۔ جیسا کہ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد آشا کا حسن میری نظروں کو خیرہ کرنے لگا۔ ویسے شادی کے بعد وہ نکھر بھی آئی تھی۔ شائد یہ ہماری دلآویز محبت کا کرشمہ تھا' اُس پہاڑی مقام کی فضا کا اثر تھا جہاں نئی فیکٹری کھولی گئی تھی یا پھر دیکھا گیا ہے کہ لڑکیاں عموماً شادی کے بعد اُجلی اُجلی سی ہو جاتی ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آشا کی محبت اور وفا شعاری میرے لیے غیر متوقع مسرت کا ایسا لازوال تحفہ لے کر آئی کہ میں دن رات اس میں سرشار رہنے لگا۔ میری زندگی گویا ایک ایسی ریل کار کی طرح ہوگئی جو ریگزاروں سے ایک آبشاروں' رنگین پرندوں اور بھیگے سبز درختوں والے خوشبودار جنگل میں داخل ہوگئی ہو۔ آشا نے تو اس فرسودہ بات کو بالکل ہی غلط ثابت کر دیا کہ بیوی اپنے سے نچلے اور شوہر اپنے سے اوپر کے خاندان سے ہونے چاہئیں۔

وہ اس تندہی سے میرا خیال رکھتی کہ میں شرمندہ ہو جاتا۔ یوں لگتا کہ گویا اسے پیدا ہی میرے لیے کیا گیا ہے۔ صبح سویرے میرے جوتے وہ خود اپنے ہاتھوں سے پالش کرتی اور کپڑے استری کر کے جب تک میں غسل سے فارغ ہوتا بھاپ اُڑاتا ناشتہ لگا دیتی۔ امیر گھر کی پرورش کے باوجود میرا کھانا اپنے ہاتھ سے تیار کرتی۔ ویسے میں بھی ضرورت پڑنے پر اُس کے تھکے بدن کو دبا دیا کرتا۔ پھر جب تک میں فیکٹری میں رہتا وہ بے چینی سے میرا انتظار کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی کام کا ایک ایک پل اس انتظار میں بتاتا کہ کام ختم ہونے کا وقت آئے اور میں اُڑتا ہوا گھر پہنچ کر اُسے اپنے بازوؤں میں بھرلوں۔

اُس کی بے پایاں محبت نے شادی کے چند ماہ بعد میری اپنی ماں کی وفات کے زخم کو بھی کچھ حد تک مندمل کر دیا۔

اِس دوران وہ میرے ضد کرنے پر چند ہی مرتبہ اپنے ماں باپ سے ملنے میدانوں میں لوٹی۔ اُس نے خود سے تو نہ کہا تھا لیکن چند ایک مرتبہ اُسے ماں باپ کی یاد میں غمگین ہو کر روتے دیکھ کر میں نے اُسے زبردستی میکے بھیجا۔ فیکٹری ابتدائی مراحل میں تھی۔ کام کا بوجھ بھی زیادہ تھا سو میں خود تو نہ جا سکا مگر مالک اور اُن کی بیگم کے لیے چند تحائف بھیجنا نہ بھولا۔

ماں باپ کی یاد میں آنسو بہانے کے سوا صرف ایک مرتبہ میں نے اُس کی آنکھوں کو نم دیکھا۔

ہوا کچھ یوں کہ ایک رات جب پائیں باغ میں لگے سیاہ گلاب کی خوشبو ہمارے کمرے کی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی اور سامنے ایک بہت بڑا چاند سفید روشنی میں دمک رہا تھا تو میں نے آشا سے پوچھ ڈالا کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ کیا وہ اور شادی کر لے گی۔

میں نے دیکھا ہے کہ عام طور پر چاند ویرانوں، ریگستانوں اور پہاڑوں سے زیادہ بڑا دکھتا ہے۔

خیر، میرے سوال کے جواب میں وہ کچھ دیر تو خاموش رہی۔ پھر دھیرے سے بولی تھی کہ اُس نے میرے سوا اپنی پوری زندگی میں کسی مرد کا تصور تک نہیں کیا سو کبھی نہ تو اس طرح سوچا ہے اور نہ ہی مجھ سے دوبارہ اس نوعیت کے سوال کی توقع کرتی ہے۔

جب مجھے اپنے سینے کے بالوں میں اُس کے آنسوؤں کی نمی کا احساس ہوا تو میں نے اُس کی گیلی آنکھوں کو چوم لیا اور اُسے اس طرح سے سینے سے لگا کر بھینچا کہ خود میرے حلق سے ایک لمبی آہ نکل کر سیاہ آسمان کی وسعتوں میں تحلیل ہو گئی۔

محبت کرنے والے محبت کے انتہائی لمحات میں ایک دوسرے سے اس طرح کے جذباتی کر دینے والے سوال نہ جانے کیوں پوچھتے ہیں۔

جبکہ جذباتی ہونے کے لیے زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آشا کی کینسر سے موت۔

وہ کچھ عرصے سے بخار میں رہنے لگی تھی۔ پہاڑی علاقے کے ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے اُس کو بہت سی دوائیں دیں لیکن افاقہ نہ ہوا۔ جب ہم میدانی ہسپتالوں میں پہنچے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے فقط اتنا کہا کہ وہ آشا کی موت کو بس کم تکلیف دہ بنا سکتے ہیں۔

عجیب بات تو یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ میں اُسے دِلاسا دیتا وہ مجھے دِلاسا دیا کرتی تھی۔

اور پھر وہ مر گئی۔

بہت سے لوگ ایسے موقعے پر کہتے ہیں کہ 'میری دنیا اندھیر ہو گئی' 'میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی' وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں تو صرف اندر سے بجھ گیا تھا۔ لوگ رُوح کا ذکر کرتے ہیں۔ رُوح کے نکلنے سے انسان مر جاتا ہے۔ مگر شائد کوئی ایک شعلہ سا بھی ہوتا ہے جو جب تک انسان کے اندر جلتا رہتا ہے تو وہ او ہے کی کھلونا کشتی کی طرح خوب تیرتا رہتا ہے اور جب یہ شعلہ' بھلے جوانی میں یا بڑھاپے میں' بجھ جائے تو انسان زندہ تو رہتا ہے مگر بے رس ہو جاتا ہے' ایک خشک گنے کی طرح۔

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا کہ زندگی دلچسپ اور غیر متوقع واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔ مگر میں یہ بیان کرنا بھول گیا کہ ان غیر متوقع واقعات میں عموماً زیادہ تر واقعات غم کی لو پر پکتے ہیں اور انسانی تصورِ انصاف سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔

آشا کی قبر میری ماں کی قبر سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ ایک خاص اہتمام میں نے ضرور

کیا اور وہ یہ کہ آشا کی قبر کے سرہانے کاسنی پھولوں کا ایک پودا لگایا۔ اُسے کاسنی رنگ پسند جو بہت تھا۔

مالک کو کہہ کر کچھ عرصے کے لیے واپس میدانوں میں تبادلہ بھی کروالیا۔

ہر جمعرات کو قبرستان جانا' پہلے والدہ پھر آشا کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر آشا کی قبر کے ساتھ میں بیٹھ جانا اور اُس سے خوب باتیں کرنا ایک معمول بن گیا۔ کبھی شکوہ کرتا کہ اُس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اپنی موت کا کبھی ذکر نہیں کروں گا پھر خود ہی خاموشی سے کیوں مرگئی۔ کبھی اپنے ہونے والے بچوں کے ناموں پر تکرار کا شکوہ کرتا۔ کیا ضرورت تھی تکرار کی اگر' خیر چھوڑیئے۔

میرا دل کچھ ایسا اُچاٹ ہوا کہ مالک کی اجازت سے بیرون ملک ایک ملازمت کے لیے درخواست دی اور منظور ہونے پر باہر چلا گیا۔

سال کے گزرنے کا احساس صرف والدہ کی اور آشا کی برسی پر ہوتا۔

والدہ کی طبعی موت اتنا بڑا دھچکا نہ تھی جتنا کہ آشا کی موت ایک ایسا سانحہ تھی جو ہر برسی پر ایک خنجر کی طرح میری شہ رگ کو کاٹ ڈالتی تھی۔

مجرد زندگی کے کئی سال گزر گئے۔ کافی دولت اکٹھی کرلی۔

یہ کوئی ایک دہائی سے بڑھ کر بات ہوگی کہ نوکری کی ضرورت کے تحت وطن واپسی کا پروگرام بنا۔

واپسی اپنے ہی شہر میں ہوئی۔ آشا کی وفات کے بعد ویسے بھی سسرال سے رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ بس ایک رسمی تعلق قائم تھا سو ایک ہوٹل میں سامان رکھا اور ٹیکسی پر قبرستان کا رُخ کیا۔

رستہ بھر سوچتا رہا تھا کہ ماں کو سلام کر کے آشا سے خوب دل ہلکا کروں گا۔ آخر کو میرے یہی تو دو رشتے تھے۔

اُس روز ویسے بھی اتفاقاً جمعرات تھی۔

ٹیکسی قبرستان کے باہر رخصت کر کے میں دھیرے دھیرے قبروں کی طرف بڑھا۔ خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ کوئی قطعہ خالی نہ بچا تھا۔ ہر سو قبریں گویا اُگ ہی آئی تھیں۔ چند قبروں پر لوگ فاتحہ خوانی کر رہے تھے تو چند ایک پر اگربتیاں سُلگ رہی تھیں۔

شام کو جھٹپٹے میں اگر بتیوں کا سلگنا کیسا عجیب اور یاسیت انگیز ہوتا ہے۔

میں قبروں میں رستہ بناتا چلتا رہا۔ بیچ کے گزرے برس ہتھیلی پر انڈیلی اسپرٹ کی طرح ہوا ہو چکے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میں ابھی پچھلی جمعرات کو ہی وہاں آیا تھا۔

میرا رُخ ماں کی قبر کی طرف تھا۔ آشا کی قبر رستے میں پڑتی تھی سو سوچا کہ وہاں پر نظر کرتا ہوا گزر جاؤں پھر لوٹ آؤں گا۔ اُس کی قبر تو اِس طرح دیگر قبروں میں گھِر چکی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی۔ قبر کے سرہانے کاسنی پھولوں والا پودا ایک تناور درخت بن چکا تھا۔

میں ہیجان میں آگے بڑھا تو ٹھٹھک کر رُک گیا۔

ایک لفظ' فقط ایک لفظ کسی انسان کی زندگی کا رُخ اور سوچ کے زاویے کیسے یکسر بدل سکتا ہے' اس کا ادراک مجھے اُسی روز' بلکہ اُسی وقت ہوا۔

آشا کی قبر پر اگر بتیاں سُلگ رہی تھیں اور ایک بارہ چودہ برس کا لڑکا سفید ٹوپی پہنے فاتحہ پڑھ رہا تھا۔

ایک انجانی حیرت نے مجھے اپنے غلبے میں لے لیا۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں اُس لڑکے کے پیچھے سے گزرا تو اُس نے کوئی دُعا پڑھ کر ہاتھ چہرے پر پھیرے۔

میں صرف ایک لفظ سُن سکا۔۔۔۔''ماں''۔۔۔۔

یہ بول کر وہ لڑکا مُڑا اور ایک ٹانگ کو گھسیٹ کر لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔

شدید ترین سُن کر دینے والی ایک کیفیت میں میں آگے بڑھ گیا اور اپنی ماں کی قبر سے لپٹ کر آنکھوں میں ہتھیلیاں گڑ کر رونے لگا۔

بھونچال

وہ تو شکر ہے مہربان صورت نیگرو کیب ڈرائیور سفیرالدین کو ان کے اپارٹمنٹ کے دروازے کے باہر چھوڑ گیا ورنہ ان کی حالت تو ایسی ہو رہی تھی کہ وہ بارہ منزلیں نیچے فٹ پاتھ ہی پر گر پڑتے۔ ایسا ہوا تو کبھی نہیں تھا۔ نہ تو کبھی انہوں نے اتنی پی تھی اور نہ ہی کبھی نیویارک جیسے چوبیس گھنٹے جاگتے رہنے والے تیز رفتار شہر میں کسی کیب ڈرائیور کے پاس اتنا وقت ہوا تھا کہ وہ کسی مسافر کی اتنی مدد کرے۔

اپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے لاک کرنے کے بعد وہ لڑکھڑاتے ہوئے ریسٹ روم کی جانب لپکے۔ دروازہ کھول کر ایک دم واش بیسن کے سامنے دہرے ہو گئے۔ قے حلق تک آتے آتے رک گئی۔ ایک کڑوا کسیلا لیس دار مادہ منہ میں بھر گیا جسے انہوں نے تھوک دیا۔ طبیعت بہت بھاری ہو رہی تھی۔ وہ بیسن پر جھکے ہوئے تھے۔ بالآخر ایک طویل ہچکی حلق سے برآمد ہوئی اور کھٹی ڈکار کی صورت میں نتھنوں اور حلق سے خارج ہوتی چلی گئی۔ طبیعت کا بوجھل پن کچھ کم ہوا۔ لڑکھڑاتے ہوئے واپس مڑے تو واش بیسن کے آئینے پر نظر جا پڑی۔ سامنے بڑھی ہوئی سفید شیو، آنکھوں تلے پھولے سیاہ حلقے اور ٹھوڑی تلے لٹکتی جلد والا ایک پژمردہ سا بوڑھا انہیں عجیب نظروں

سے گھور رہا تھا۔ سرخ ڈوروں بھری آنکھیں پھول کر باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں اور ان سے پھوٹتی پانی کی لکیریں چہرہ بھگو رہی تھیں۔ نچلے ہونٹ تلے کچھ لیس دار مادہ جم سا گیا تھا۔ سفیرالدین کو ایک دم صدمہ ہوا۔ وہ چکراتے ہوئے آگے بڑھے اور ٹونٹی کھول کر چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر واپس کمرے میں آ گئے۔

بند کمرے میں ایئر فریشنر اور تمباکو کی ہلکی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا جی گھٹا جا رہا تھا۔ اوپر سے بند کمرے کی گھٹی گھٹی فضا سے ان کا جی اور بھی اوبھ سا گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے صوفے اور دیواروں کا سہارا لیتے وہ کھڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ ڈوری کھینچنے سے پردہ سرک گیا اور سامنے کا منظر اس طرح نمایاں ہو گیا جیسے سٹیج کا پردہ ہٹنے سے پس پردہ منظر سامنے آ جاتا ہے۔

شیشے پر پانی کے قطرے رقصاں تھے۔ شاید بارش تھم گئی تھی اور اب صرف پھوار شہر پر نازل ہو رہی تھی۔ سامنے بلند و بالا کئی منزلہ عمارتیں نظروں کا رستہ روکے سینہ تانے کھڑی تھیں۔ ان کا اپارٹمنٹ صرف بارہویں منزل پر تھا اس لیے سامنے کی عمارتوں کی کھڑکیاں ہی نظر آتی تھیں۔ چند کھڑکیاں روشن تھیں اور بیشتر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اپارٹمنٹس کی بتیاں تھیں یا چراغ ہائے آرزو کہ بجھتے ہی چلے جاتے تھے۔

سفیرالدین کی نظریں کسی ایک شے پر جم ہی نہیں رہی تھیں۔ دماغ بھی کسی ایک سوچ پر مرتکز نہ ہو پا رہا تھا۔ بس ایک آگ تھی جو سینے میں لگی ہوئی تھی اور آندھی جھکڑ طوفان تھے جو دماغ میں چل رہے تھے۔ جسم احساسِ لاچارگی سے ٹھنڈا ہوا جاتا تھا۔ ایک عجب عالم یاسیت تھا جو مدہوشی میں اور بھی شدت سے رقصاں تھا۔ یہ رقص معرفت تھا یا رقصِ ابلیس تھا۔ باہر پانی کے قطرے شیشے سے ٹکراتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ معصوم فرشتے اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہے ہوں یا پھر شاید جہنم میں سلگائی گئی آگ میں چٹختی لکڑیوں کی آواز تھی؛ سفیرالدین نہ جانتے تھے اور نہ ہی جاننا چاہتے تھے۔ وہ حال میں زندہ تھے اور ماضی پرست تھے۔ مستقبل کے متعلق سوچنے کا تکلف ان کے مزاج کو بھاتا نہ تھا۔ کھڑکی کھلی تو سرد کٹیلی ہوا ایک دم کمرے میں بھر آئی۔ پھوار بند ہو چکی تھی۔ ہوا پرنم تھی۔ یہ نمی ان کو بہت خوشگوار لگی۔ وہ کھڑکی کی سل پر بیٹھ گئے۔ نظر اٹھائی تو کھڑکیاں قطار در قطار سیڑھیاں چڑھتی نظر آئیں۔ آسمان نے بادلوں کا نقاب لے رکھا تھا۔ ان کے جی میں یہ خواہش

مچل اٹھی کہ بادل چھٹ جائیں اور وہ چاند دیکھ سکیں مگر لحظہ بھر میں یہ خواہش بھی بجھ گئی۔

تیز ہوا نے ان کا نشہ دو چند کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ چاند دیکھے بغیر جنوں کا یہ عالم ہے تو اگر اسے دیکھ لیا تو حالت ان روسی برفانی بھیڑیوں کی سی نہ ہو جائے جو چاند راتوں کو ویرانوں میں ٹیلوں کی بلندیوں پر چڑھ کر چاند کی جانب اپنی تھوتھنیاں اٹھائے کرب میں آہ وزاری کرتے ہیں۔ اپنی اس بے معنی اور بے ربط سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دیئے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا' وہ چکرا سے گئے۔ کھڑکی سے اٹھ آئے۔ ٹانگیں جواب دیتی محسوس ہوئیں' دھم سے بستر پر آن گرے۔

نیچے سڑک پر کوئی ایمبولینس سائرن بجاتی گزر گئی۔ کئی لمحوں تک اس کے سائرن کی آواز ہوا میں منجمد رہی پھر آہستہ آہستہ پگھل گئی۔ سفیرالدین نیم وا آنکھوں سے بستر پر دراز تھے۔ خواہش تھی کہ لباس تبدیل کر لیں۔ چمڑے کی بیلٹ ان کی کمر میں چبھ رہی تھی اور قمیص پر خارج زدہ مادے کی بساند ناگوار گزر رہی تھی۔ لیکن حالت یہ تھی کہ دو قدم چلنے کی ہمت نہ تھی۔ نیم وا آنکھوں میں تیرتی نظریں چھت پر آوارگی کرتی ہوئی ایک مقام پر رک گئیں۔ لائٹ شو ہو رہا تھا۔ نیچے سڑک پر گزرتی تیز رفتار گاڑیوں کی ہیڈ لائٹیں بارش کے پانی اور مختلف شیشوں سے منعکس ہو کر چھت پر روشنی کا کھیل کھیل رہی تھیں۔

سفیرالدین کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

''دیکھ سفیرے یہ ڈبی مجھے واپس کر دے۔''

نذر دس سالہ سفیرالدین سے تقاضا کر رہا تھا۔ سفیر نے ہاتھ میں ماچس کی ڈبیا پکڑی ہوئی تھی اور وہ ذرا ذرا دیر بعد ڈبیا کو تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکتا تھا۔ اندر دو جگنو قید تھے۔ وہ دونوں قریبی پھلوں کے باغ میں رات کو جگنو پکڑنے آئے تھے۔ اب نذر کی باری تھی لیکن سفیر اسے باری دینے سے انکار کر رہا تھا۔ نذر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس پر سفیر کا دل نرم پڑ گیا۔ اس نے نذر کو ڈبیا پکڑا دی۔ نذر نے ڈبیا تھوڑی سی کھولی۔ اندر جھانکا تو صرف ایک جگنو جل رہا تھا۔ دوسرا مر چکا تھا۔ سفیر جگنو کے مرنے پر اس رات اتنا رویا کہ ہچکیاں لگ گئی تھیں۔ اس کے ماں باپ نے اسے کئی نئے جگنو لا کر دینے کا وعدہ کیا مگر اسے تو وہی والا جگنو چاہیے تھا۔ اور پھر وہ روتے روتے سو

گیا تھا۔

ایک کڑوی کسیلی ڈکار سفیرالدین کے سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ ان کے سر کو چڑھی جارہی تھی۔ سفیرالدین مسہری کی پشت پر زور دے کر تھوڑے سے اٹھے۔ ایک تیزابی ڈکار ان کے حلق کو جلاتی ہوئی خارج ہوئی۔ سفیرالدین سرسامی کیفیت میں بڑبڑائے ''ڈیگو روز پلا دیتا ہے۔ کہتا بھی ہے کہ سرور لینے کے لیے پیتا ہوں مگر وہ کم بخت بھولنے اور بھلانے کے لیے پلاتا ہے۔ چلو شاید اچھا ہی کرتا ہے۔ دو چار دن رہ گئے ہیں۔ پر لگا کر اڑ جائیں گے۔''

ڈیگو اور بج سفیرالدین کے قریبی دوست تھے۔ ہسپانوی نژاد بوڑھا ڈیگو ایک ہسپانوی ریستوران میں بینجو بجاتا تھا۔ اپنی نائیجیرین گرل فرینڈ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس میں ایک متانت اور رکھ رکھاؤ تھا۔ دیہات میں سردیوں کی شاموں کو الاؤ کے گرد بیٹھے حکایت گو بزرگوں کی سی دانش تھی۔ کشادہ پیشانی پر گہری لکیریں کندہ تھیں۔ وہ پی کر کبھی آپے سے باہر نہ ہوتا تھا۔ بس اور زیادہ خاموش ہو جاتا تھا۔ وہ روز رات کو ریستوران سے سیدھا بار کا رخ کرتا۔ یہ بار سفیرالدین کو بہت پسند تھی۔ چھوٹی سی بار میں چند مخصوص لوگوں کا آنا جانا تھا جو زیادہ تر ادھیڑ عمری کی دہلیز پر یا تو قدم رکھ چکے ہوتے تھے یا اسے پار کر چکے ہوتے تھے۔ یہ لوگ بہت جلدی میں نظر نہ آتے تھے اور زندگی کو آزمانے کے بعد ان میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ بار میں آنے والے زیادہ تر لوگوں میں ایک جان پہچان پیدا ہو چکی تھی۔ بار کا مالک قانع انسان تھا۔ شاید اسی لیے بار میں ایک قصباتی سی اپنائیت تھی۔ کچھ جانا جانا سا تھا۔

بج سابقہ کنسٹرکشن ورکر اور ایک گروسری سٹور کا موجودہ مالک تھا۔ بھورے بالوں والے تنومند ادھیڑ عمر بج کے فولادی بازوؤں پر ایک جل پری اور آرٹ ڈیزائنوں کے نمونے کندہ تھے۔ شاید اسی لیے وہ زیادہ تر بغیر آستینوں کی قمیض پہنتا تھا تاکہ اجنبی اس کے مضبوط بازوؤں سے اور آرٹ کے دلدادگان ان پر کندہ کاری سے مرعوب رہیں۔ سفیرالدین چند ہی دنوں کی ملاقاتوں کے بعد سمجھ گئے کہ بج جتنا دیو قامت نظر آتا ہے دل کا اتنا ہی چھوٹا ہے۔ ایک مرتبہ بار کے باہر کہیں کسی تیز رو کار کا ٹائر دھماکے سے پھٹا تو بج انتہائی سراسیمگی میں میز کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ بعد میں اس نے اس واقعے کو مزاح کا رنگ دینے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی معصوم مردانگی

کے بارے میں سفیرالدین کا تاثر مزید پختہ ہوگیا۔

پچ ہر پانچ سات ماہ بعد ایک نئی لڑکی کے ساتھ نظر آتا تھا۔ وہ مخصوص رسالوں اور اشیاء کا باقاعدہ خریدار بھی تھا۔ یہ بات اس نے سفیر کو آنکھ مارتے ہوئے بتائی تھی۔ تب سفیرالدین جھینپ سے گئے تھے۔

سفیر کے دوست ان کو سیف کے نام سے پکارتے تھے۔

سفیرالدین ایک عجب کیفیت میں تھے۔ نیند آنکھوں سے بہت دور تھی لیکن دماغ پر غنودگی سی بھی طاری تھی۔ طبیعت کچھ اعتدال پر آگئی تھی لیکن سر درد شروع ہوگیا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے مختلف شکلیں اور خیال ان کے ذہن میں ابھر اور مٹ رہے تھے۔ ایک طویل خواب محسوس ہوتا تھا۔ بے سمتا خواب، گڈمڈ سوچیں، نئے نئے چہرے، پرانی شکلیں، مانوس آوازیں، غیر مانوس شور، بار میں موسیقی کا شور اور اماں برکتے کا پاکیزہ چہرہ۔

اماں برکتے ـــــ اس کی ماں، پاکیزہ اور خاموش، لسی بلوتی ہوئی، گھر کے کچے ویہڑے میں چاول چھنتی ہوئی، کنک چھانتی ہوئی، ساگ کترتی ہوئی، ہاون دستے سے مصالحہ پیستی ہوئی، سفید سوتی کپڑے پہنے قصبے میں کسی مرگ میں شریک دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی، کسی کا بچہ گم ہو جانے کی خبر سن کر اپنے بچوں کو کوٹھڑی میں چھپا دینے والی اماں برکتے ـــــ اس کے قصبے میں کئی اماں برکتے تھیں۔ بس نام مختلف تھے۔ کوئی مائی صفیہ کے نام سے جانی جاتی تھی تو کوئی خالہ نوراں کہلاتی تھی۔ سب کے بچے سانجھے تھے جیسے سب کے غم اور خوشیاں ایک تھیں۔

صبح تڑکے اس کی ماں قرآن پاک کا ورد کر کے گھڑے کے پانی میں کئی پھونکیں مار دیا کرتی تھی۔ اس کی انہی پھونکوں کے صدقے کسی بچے کو اماں کے جیتے جی کوئی خاص بیماری نہ لگی۔ اماں کو دم درود پر بہت یقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کوئی بچہ تھوڑا بہت بیمار ہو جاتا تو اس کا علاج علاقے کے حکیم یا ڈسپنسر کے بجائے ان کے علاقے کے پیر سے کرایا جاتا۔

اس کا باپ ماسٹر اسلم دین سکول میں کچی جماعتوں کا ماسٹر تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اپنے نیم خواندہ محلے میں اس کی بہت عزت تھی۔ کسی خوشی، شب برات کے موقع پر اس کے شاگردوں کے والدین خود ہی اس کے گھر میٹھے چاول، حلوہ کلیجے پہنچا دیتے تھے۔ کٹائی کے موقعوں

پر بھی اس کے نیم پختہ گھر کے گودام میں اناج کا انبار لگ جاتا۔لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے ماسٹر اسلم سے اکثر مشورہ کرتے تھے۔ سیاسی حالات پر تبصرہ ہو یا ریڈیو پر کسی خبر کے پس پردہ کوئی بین الاقوامی سازش، ماسٹر اسلم کی رائے حرف آخر مانی جاتی تھی۔

سفیرالدین کے ماں باپ میں بڑا پرتکلف تعلق تھا۔ایک فاصلہ تھا، ان دیکھی ایک دیوار تھی جو میاں بیوی میں حائل تھی۔آپس میں شاذ و نادر ہی کوئی مذاق ہوتا۔مہمانوں کے سامنے دونوں زیادہ اجنبی ہو جاتے، بیچ میں زیادہ احترام عود کر آتا۔

ماسٹر اسلم کو اماں برکتے نے ہر قسم کا آرام دیا۔ ہر صبح جب وہ محلے میں لگے کمیٹی کے نل سے نہا کر آتا تو اسے دھلے دھلائے استری شدہ کپڑے ٹنگے ملتے۔کمرے میں لٹکے گول شیشے کے سامنے جب وہ تیل کنگھا کر رہا ہوتا تو لسی پراٹھے کا ناشتہ ویہڑے میں لگ گیا ہوتا۔گھر کی مرغیوں میں سے کسی نے انڈہ دیا ہوتا تو رات کے بچے سالن کے ساتھ وہ بھی خوب اہتمام کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ویہڑے میں ٹنگی تار گیلے دھلے کپڑے سکھانے کے علاوہ ایک جالی دار ٹوکری لٹکانے کے کام بھی آتی۔اس ٹوکری میں رات ہی کو کھانے پینے کا سالن، ترکاری یا دودھ رکھ دیا جاتا تاکہ وہ زیادہ دیر تازہ رہ سکے اور دودھ بلی کی پہنچ سے دور رہے۔ایک جانب نیم پختہ دیوار کے ساتھ مرغیوں کا ڈربہ تھا جس میں مرغیوں کو مغرب کی اذانوں کے ساتھ ہی بند کر دیا جاتا تاکہ وہ جانوروں سے محفوظ رہیں۔سبزی ترکاری تانگے ریڑھے والا دے جاتا۔تانگے پر تازہ سبزیاں سینت سینت کر سجائی ہوتیں۔اماں برکتے دروازے کی اوٹ ہی سے بھاؤ تاؤ کرتیں۔غرضیکہ اماں برکتے اور ماسٹر اسلم کا گھر ایک قصباتی پرسکون گھرانے کا من موہنا نمونہ تھا۔نہ دولت کی ریل پیل اور نہ ہی بہتات کی ہوس نے زندگی کے سکون کو درہم برہم کیا تھا۔ابھی ناحق قتل پر سرخ آندھیاں چلنا بھی بند نہ ہوئی تھیں۔

جب سفیر ابھی دس بارہ برس کا ہی ہوگا تو اماں برکتے خاموشی سے گزر گئیں۔ جب ویہڑے میں بچھی چارپائی پر دھوپ پوری طرح اتر آئی، ماسٹر اسلم کمیٹی کے نل سے نہا کر بھی آ گیا لیکن اماں برکتے منہ پر چادر تانے سوئی رہی تو اسے تشویش ہوئی۔اس نے اماں کو آوازیں دیں۔ وہ سوئی رہی۔پہلی مرتبہ ——— ہاں اپنے بچوں کے سامنے پہلی دفعہ اس نے اماں کو چھوا۔ پھر

جھنجھوڑا۔اماں نہ اٹھی۔سفیرالدین کے ذہن سے بین کرنے والی عورتوں کی آوازیں چپک گئیں۔ ساری عمر وہ اسے ستاتی رہیں۔ ہر غم کے موقع پر وہ واپس آجاتیں۔اس نے اس یاد کو بھگانے کی ناکام کوشش کی۔اس کا باپ جو اماں سے اجنبی اجنبی رہتا تھا اس کے مرنے کے بعد ایک رات میں ہی بوڑھا ہوگیا۔بیس برس ایک رات میں گزر گئے اور ایک رات بھی بیس برس میں نہ گزری۔

نیم مدہوشی میں لیٹے سفیرالدین کے دماغ میں بین کی وہ آوازیں پھر سے جاگ اٹھیں۔عورتیں رو رہی تھیں' سینہ کوبی کر رہی تھیں۔خلاف توقع ان عورتوں میں اماں بر کتے نہ تھی۔ سب آوازیں ویہڑے میں، اندر کمروں میں گونج رہی تھیں۔خوفزدہ مرغیاں دم سادھے اپنے پروں میں منہ چھپائے ڈبوں میں قید تھیں۔پھر مرغیاں کٹ کٹانے لگیں—— مرغیوں کے کٹ کٹانے کی آوازیں عورتوں کے بین میں شامل ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ حاوی ہو گئیں۔ مرغیاں کٹ کٹا رہی تھیں۔عورتیں بین کر رہی تھیں۔پھر عورتیں کٹ کٹانے لگیں اور مرغیاں بین کرنے لگیں—— یہاں تک کہ سب آوازیں مل کر ایک آواز بن گئیں۔

ایک عورت اونچی آواز میں رو رہی تھی۔اپارٹمنٹ کے باہر راہداری میں ایک عورت اونچی آواز میں رو رہی تھی اور کسی اجنبی زبان میں چیخ رہی تھی۔شائد میاں بیوی میں لڑائی ہوئی تھی۔ شائد مرد نے گرل فرینڈ کو پیٹا تھا۔شائد عورت پر مرد کی بیوفائی ظاہر ہوئی تھی۔شائد ہسٹریا تھا۔ شائد اس عورت کو جن ہو گیا تھا۔

ماجھا چنگڑ جب ایک کچھا پہنے جسم پر گند بلا لپیڑے بُو وبُو ہوئے محلے سے گزرتا تو کچھ بچے تو سہم جاتے اور کچھ چھوٹے چھوٹے ونٹے ہاتھوں میں پکڑے اس کا پیچھا کرتے۔آس پاس کے محلوں سے بچے اکٹھے ہوتے جاتے یہاں تک کہ ایک جلوس مکمل ہو جاتا جو ماجھے کا پیچھا کرتا۔ یک آواز سب بولتے جاتے۔

''ماجھے کا جو یار ہے—— بیکار ہے۔ماجھا چنگڑ ہائے ہائے''

ماجھے نے کبھی کسی کو غصے سے گھور کر بھی نہ دیکھا تھا' نہ ہی کسی کا پیچھا کیا' بس سب کو دیکھ کر ہنستا رہتا۔رال اس کی جھاڑ جھنکار داڑھی میں اٹکی رہتی۔اس کے پیر کیل کانٹوں سے زخمی ہوئے جاتے تو کبھی کہیں میلے جسم پر چوٹ کا کوئی نشان ہوتا مگر وہ اک شان بے نیازی سے چلتا

جاتا۔ بے نیاز تو وہ ہو ہی چکا تھا مگر وہ سودائی بھی تھا۔

جیسے جیسے قصبے کی حدود ختم ہوتی جاتیں ہجوم چھٹتا جاتا یہاں تک کہ قصبے کے شمال مغرب میں واقع بنجر ٹیلے تک پہنچتے پہنچتے وہ اکیلا رہ جاتا۔ ٹیلے کے پرے ایک کھنڈر نما کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی میں ایک نابینا بیوہ اور اس کا ذہنی معذور بچہ رہتے تھے۔ وہ کس پر پل رہے تھے وہی بہتر جانتے تھے۔ ہاں البتہ ماجھے کے معمولات میں وہی ایک مقامِ قیام تھا۔ ایک لحظہ کو وہ وہاں قیام کرتا' اپنے کھیسے میں سے کبھی کشمکش بادام، تو کبھی ریوڑیاں چنے نکالتا اور ماتا بھری محبت سے کوٹھڑی میں اچھال دیتا۔ یہ سب کچھ نہ جانے وہ کہاں سے حاصل کرتا تھا۔ البتہ کوٹھڑی کے اندر یہ سوغات اچھالتے وقت اس کا چہرہ دن دو دن میں پہلی بار سنجیدہ ہو جاتا۔

کہتے تھے کہ بچپن میں وہ ٹھیک تھا۔ پھر ماجھے کو جن ہو گیا۔ سرسبز و شاداب لہلہاتے سبزے کی مہک سے مہکتے اور پھلوں کے باغات سے آباد علاقے سے پرے وہ قریبی دریا کے ساتھ دلدلی علاقے کے کنارے ایک جھگی میں رہتا تھا۔ قصبے کے کچھ مخیر لوگ اس کو ہر دوسرے چوتھے روز خوراک پہنچا دیتے تھے۔ چند عورتیں اس بات پر یقین رکھتی تھیں کہ وہ اللہ لوک تھا' پیر تھا' فقیر تھا' من مراد پوری کرنے پر قادر تھا۔ یہ تو ڈھونگ سوانگ تھا جو اس نے رچایا ہوا تھا۔ پھر ایک دن وہ اچانک غائب ہو گیا۔ چند لوگ خیال کرتے تھے کہ وہ دریا میں ڈوب گیا ہے۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ کسی اور دھرتی کو چلا گیا ہے اور تھوڑے بہت یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ کسی جنگل ویرانے میں رب سے دھیان لگائے بیٹھا ہے۔ البتہ اس کی گمشدگی کے بعد کسی نے کبھی ٹیلے پیچھے کھنڈر میں آباد بیوہ اور اس کے ذہنی اپاہج بچے کا ذکر تک نہیں سنا۔

نہیں یہ جن نہیں ہو سکتا۔ امریکہ میں تو کسی کو جن نہیں ہوتا۔ من چاہا کہ باہر نکل کر چیخنے والی عورت کو موٹی سی گالی دے کر دفعان ہو جانے کا کہیں۔ نشہ کافی حد تک زائل ہو چکا تھا مگر سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سرسامی کیفیت البتہ ختم ہو گئی تھی۔ کمرہ یخ ٹھنڈا ہو رہا تھا لیکن ان میں اتنی قوت نہ تھی کہ اٹھ کر کھڑکی بند کرتے۔

عورت کے رونے کی آواز دھیمی پڑ چکی تھی۔ اب اس کی آواز میں کسی مرد کی آواز شامل

ہوگئی تھی۔ مردانہ زنانہ ملی جلی آوازیں بھنبھناہٹ کی صورت میں ان کے اعصاب چٹخا رہی تھیں۔ مکھیاں انہیں ہالے میں لیے بھنبھنا رہی تھیں۔

روشنی کا ایک جھما کا سا ہوا۔

مردوں اور عورتوں کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہسپتال کا میٹرنٹی وارڈ تھا۔ وہ باپ بننے کے تجربے سے پہلی بار گزر رہے تھے۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹنے پڑ رہے تھے اور دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا کہ جیسے سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وارڈ کے باہر عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم تھا۔

وہ غنودگی کی حالت میں یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ سب لوگ وہاں کیا کر رہے تھے۔ درگاہ کے زائرین تھے' کھیل تماشے کے تماشائی یا —— ایک دم انہیں یاد آ گیا، بے ربط خیالوں میں' سوچوں میں ان کو یاد آ گیا ——

امیر الدین، ان اکلوتا بیٹا، وہیں تو پیدا ہوا تھا۔

ان کو خوب یاد آ گیا کہ وہ سب لوگ مختلف امیدیں لیے بیٹھے تھے۔ سب منتظر تھے اور انتظار کا کرب دور کرنے کے لیے بے معنی باتیں کر رہے تھے۔ انتظار گاہ میں مردوں اور عورتوں کی آوازیں مکھیوں کے چھتے کی سی بھنبھناہٹ سے مشابہ گونج رہی تھیں۔

ہر طرف بھنبھناہٹ کا جھنجھلا دینے والا شور تھا۔

جب ان کا پچیس برس کا کڑیل جوان بیٹا امریکہ کے لیے روانہ ہوا تو ایئر پورٹ پسنجر لاؤنج کے باہر سب جگہ مسافروں کے اعزا و اقربا کی بھنبھناہٹ سے گونج رہی تھی۔ سارا شہر بھنبھنا رہا تھا۔ خاموشی اور سکون صرف ایک جگہ تھا۔ اس کی بیوی۔ امیر الدین کی ماں کی قبر۔ بلکہ وہ پورا قبرستان خاموش تھا۔ بھنبھناہٹ کے سمندر میں خاموشی کا جزیرہ۔

تصویر واضح ہوگئی۔ وہ اور ان کا بیٹا قبر کے تعویز کے ساتھ موتیے کے ہار ڈال رہے تھے اور ہوا سے بچاتے ہوئے، اک ماچس سے اگر بتیاں سلگا رہے تھے۔ ہاتھوں کی پیالی کے پیچھے سے سوگوار خوشبو لیے دھواں بلند ہو رہا تھا۔ اگر بتیوں کا دھواں کسی حد تک جلتی چتا کے دھوئیں سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

ان کا حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں کے رت جگے نے ان کے مختلف حواس کچھ حد تک بحال کر دیئے تھے لیکن وہ اب تک اپنی سانسوں سے آتی مئے کی مہک کو سونگھ سکتے تھے۔

چھت پر روشنیوں کا کھیل کم پڑ چکا تھا۔ باسی ہوا رخصت ہو رہی تھی اور فضا میں سحر کی مخصوص تازگی در آئی تھی۔ کمرہ یخ بستہ ہو چکا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر دیا۔ ہمت کر کے اٹھے، پانی پی کر، چکراتے ہوئے، لباس تبدیل کر کے اور کھڑکی بند کر کے انہوں نے ہیٹنگ سسٹم آن کر دیا اور روشنی گل کر دی۔ ایک آرام دہ حدت کمرے میں سرائیت کرنے لگی۔ وہ بستر پر آن لیٹے اور آنکھیں بند کر لیں۔

سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بوجھل اندھیرا۔ ہر اندھیرا اپنے اندر کوئی پیغام چھپائے ہوتا ہے۔ کبھی صبح کی نوید تو کبھی فنا کی خبر۔ کہیں بوسیدہ اہراموں میں اندھیرا صدیوں کے راز دبائے پراسرار خاموشی سے مسکراتا ہے تو کہیں حالتِ کشف میں بند آنکھوں کے پیچھے پدم ہا پدم تجلیاں لیے ایک لحظہ میں قرنوں کا سفر کرتا ہے۔

اور یہاں بھی اندھیرے نے اپنی زبان بولنا شروع کر دی۔

بیٹے کے جانے کے بعد زندگی خلاء سے بھر گئی۔ ایک دیوانگی تھی یا فرزانگی۔ ادراک کا تفاخر تھا یا زندگی کے لایعنی ہونے کے شعور سے پھوٹتی لاتعلقی۔ ان کی شخصیت میں ایک دم سے تبدیلی آ گئی۔ کوئی اس عمر میں اتنا بدل بھی سکتا ہے اُن کے جاننے والے حیران رہ گئے لیکن زندگی کے افسانے میں اگر سب کچھ متوقع ہو تو پھر زندگی ایک بے وزن شعر، ایک پھیکا بے رنگ افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔

وہ خود تو بدل ہی رہے تھے۔ جیسے نیند سے جاگے ہوں اور ارد گرد سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں، ایک ہوش سنبھالتے بچے کی طرح، لیکن حالات کہیں زیادہ تیزی سے بدل رہے تھے۔

پانچ برس بعد وہ امیر الدین کی ایک میکسیکن لڑکی سے شادی میں شرکت کے لیے امریکہ آئے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ شادی کی رسوم کچھ پاکستانی اور کچھ امریکی تھیں۔

بیٹے کی شادی ایک جذباتی دھچکا تھی تو امریکہ میں قیام ایک ثقافتی دھچکا۔ بیٹا اور بہو کام پر چلے جاتے تو وہ قریبی لائبریری میں اور کبھی پارک میں چلے جاتے۔ حلقہ احباب میں کوئی پرتگالی

بوڑھا شامل ہو رہا تھا تو کوئی افریقی بڑھیا۔ ساری زندگی کے بنے بنائے روایات کی کھڈی پر بنے معاشرتی اقدار کے پیراہن دلیل کے ننگے بدن پر سے اتر رہے تھے۔ بہت کچھ جو وہاں غلط تھا' یہاں درست لگ رہا تھا اور بہت کم کم جو وہاں درست تھا' یہاں غلط لگ رہا تھا۔ نہ جانے یہ کیا تھا۔

کمرے میں حدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ حدت زندگی بخش بھی تھی اور خوشگوار بھی۔ محفل شبینہ کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ یادوں کا پہیا آہستہ ہوا تھا مگر رکا نہ تھا ـــــ

ایک ڈیڑھ برس بعد انہیں ایک دھچکا اور لگا جب اپنے پوتے کی پیدائش پر انہوں نے بچے کے کان میں اذان دینا چاہی تو بہو نے بہت شائستگی سے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ بچہ اپنے مذہب کا انتخاب ہوش سنبھالنے کے بعد خود ہی کرے۔ بیٹے نے باپ کا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ ان کا دل ٹوٹ گیا۔ جب وہ ہسپتال سے باہر آئے تو انہیں ہر سو دھواں دھواں سا نظر آیا۔

یہ اگر بتی سے اٹھتا دھواں تھا یا شائد کوئی چتا کہیں جلتی تھی۔

انہوں نے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ بیٹے اور بہو نے بہت سمجھایا مگر وہ ہر شے سے لاتعلق ہو چکے تھے۔ اب وہ مرنے سے پہلے زندگی کو برتنا چاہتے تھے۔ روایات کی فرسودگی کا پردہ چاک کر کے ہر شے کو توجیہ اور حس کے ترازو پر تولنا چاہتے تھے۔ ''ابھی بہت دیر نہیں ہوئی کہیں اسی تذبذب میں اور دیر نہ ہو جائے۔'' وہ سوچتے۔

اب وہ ہر ذائقہ چکھنا چاہتے تھے۔ کوئی قوت کوئی بندھن ان کو روکنے والا نہ تھا۔ لذت تنہائی کا جنون ان کے اعصاب پر قابض ہو چکا تھا۔ وہ جوانی کا روشن دن گزار چکے تھے۔ سامنے اندھیری سرنگ تھی مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ اندھیری سرنگ اپنے اندر ان گنت تجلیات لیے ہوئے ہے یا پھر یہ کسی اندھے کنویں کی منڈیر تک جاتی ہے جو شائد فنا کا افقی دروازہ ہو ـــــ مکمل فنا کا۔

اس احساس زیاں نے ان کے اندر ضد بھر دی۔ وہ خود سر ہو گئے۔ بچہ جسا خود سر ہو جائے تو سنبھل سکتا ہے' بوڑھے کی خودسری کا کوئی علاج نہیں۔ وہ نیویارک منتقل ہو گئے۔ نیویارک زندگی کی علامت، بذات خود ایک جیتا جاگتا، تڑپتا مچلتا وجود، عظمت آدم کا نشان ـــــ نیویارک۔

بیٹا فرماں بردار تھا۔ ہر مہینے خرچہ دینے لگا۔ پاکستان میں جو کچھ جائداد بنائی تھی وہ بیچی اور سرمایہ امریکہ لے آئے۔ گزارہ چلنے لگا۔ وہ زندگی کے ایک نئے رنگ اور نئی خوشبو سے متعارف ہوئے۔ نئے شرابی کو تو تھوڑی سی شراب بلندی تک لے جاتی ہے مگر وہ تو خیر کئی جہانوں کی سیر کر کے آئے تھے، مگر پھر یہ کیا ہو رہا تھا؟

سفیر الدین نیند میں بڑبڑا رہے تھے۔

"اماں برکتے ـــــ اماں آنکھیں کھول۔ اماں دیکھ ابا رو رہا ہے ـــــ اماں مجھے ساتھ لے جا ـــــ ابا مت مار ـــــ ر کے بعد ڑ، ط کے بعد ـــــ مجھے وہی والا جگنو چاہیے ـــــ یار امام دین، باجی وزیراں، تم کدھر چھپ گئے ہو ـــــ یار امیر یہ تو نے اچھا نہیں کیا ـــــ یار ابا تو کہاں جا رہے ہے ـــــ بہت ٹھنڈ ہے، بہت اکیلا ہوں ـــــ اماں میرے سر میں درد ہے ـــــ میری ماں ـــــ"

بے ربط الفاظ کراہ کی صورت میں ادا ہو رہے تھے۔ آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔

سفیر الدین معصوم بچے کی طرح ایک طرف سر ڈھلکا کر سو گئے۔ ایک اکیلا ننھا منا سا آنسو ان کی آنکھ سے نکلا اور لکیر بناتا ہوا تکیے میں جذب ہو گیا۔

مولوی نور پاک آواز میں قصبے کی مسجد سے فجر کی اذان دے رہے تھے۔ صبح کی دھند آلود تازہ ہوا میں قریبی کھیتوں سے سبزے کی مہک لئے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ مولوی نور کی آواز نے سفیر الدین کے چٹختے اعصاب کو سکون دے دیا تھا۔

نیچے سے پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے ٹائروں کی چرچراہٹ فضا میں پھسلتی چلی گئی۔

باہر پھر سے بارش شروع ہو گئی۔ کھڑکی کے شیشے قطروں کی ٹپ ٹاپ سے بج اٹھے۔ یہ منتظر، معصوم فرشتوں کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز تھی یا جہنم میں سلگائی گئی منتظر آگ میں لکڑیاں چٹختی تھیں؟

سفیر الدین نہیں جانتے تھے۔

اور جب ببلو گھر واپس نہ آیا

ببلو کالا پتا ہو جانا اُس کے گھر والوں کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔
اور پھر وجہ بھی کوئی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ یہ سب کسی معمے سے بڑھ کر ہی کچھ تھا۔
ویسے بھی گھر والے تو گھر والے، ببلو اپنے محلے کا مقبول ترین اور سب سے زیادہ چاہا جانے والا بچہ تھا۔
بچہ تو خیر وہ تھا نہیں۔ آخر اٹھارہ برس کی عمر کا جوان لڑکا بچہ تھوڑی ہی ہوتا ہے۔ مگر اُس کے بھولپن اور بھلکوپن کی وجہ سے کوئی اُسے بچے سے زیادہ مقام دینے کا اور سنجیدگی سے لینے پر تیار نہ تھا۔
اُس کے چہرے پر موجود بھولپن اُس کی شخصیت کا صحیح عکاس تھا۔ پھر داناؤں نے غلط تو نہیں کہا کہ چہرہ شخصیت کی صحیح پہچان ہوتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ ایک سات سالہ بچے کا چھوٹا سا چہرہ ایک جوان کے چوڑے کندھوں پر دھر دیا گیا ہو۔
جب کبھی گول مٹول ببلو گلی میں چلا آ رہا ہوتا تو دُور سے یوں دِکھتا جیسے ایک فٹ بال لڑھکتا چلا آ رہا ہو۔ ایک تو اُس کا کھانے پینے کا انتہا کو چھوتا ہوا شوق، اور پھر شوق بھی چٹپٹی تیل میں لتھڑی

چیزوں کا جیسا کہ سموسے پکوڑے اور وہ بھی کھٹی چٹنی میں گھٹنا گھٹنا ڈوبے ہوئے۔

نام تو اُس کا فیضی تھا مگر پھر یہ ببلو کیسے پڑا۔

کافی پہلے ایک روز ایسا ہوا اور یہ بات ہے سردیوں کی' وہ گھر بیٹھا ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا اور پاپڑوں پر چورن ڈالے کھا رہا تھا کہ بجلی چلی گئی۔ میچ ایک بہت اہم موڑ پر تھا۔ ایسے میں اُسے جب کچھ اور بجھائی نہ دیا تو ہمسائے میں قریشی صاحب کے ہاں چلتے ڈیزل کے جنریٹر کی آواز اُس کے کانوں میں بھنک کی طرح پڑی۔

اطلاعی گھنٹی پر قریشی صاحب نے دروازہ کھولا تو اُن سا سنجیدہ شخص بھی ببلو کا حلیہ دیکھ کر مسکراہٹ نہ روک پایا۔ ٹی شرٹ کے نیچے شلوار کا آدھا اُڑسا آدھا لٹکتا ازار بند جھول رہا تھا۔ ہونٹوں کے گرد چورن کے ذرات اور پاپڑ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا آمیزہ ملا ہوا تھا اور آنکھوں میں التجا تھی۔

خیر، میچ انتہائی سنسنی خیز لمحات میں داخل ہو چکا تھا۔ قریشی صاحب، اُن کی گود میں بیٹھا ننھا مَوجُو اور سامنے قالین پر پھسکڑا مار کر بیٹھے اُن کے دیگر بچّے اور اُن کے دوست منہ کھولے آخری گیند کے منتظر تھے۔ آخری گیند پر قومی ٹیم کو جیتنے کے لیے ایک رَن چاہیے تھا۔ باؤلر دوڑنے کا آغاز کر چکا تھا اور پھر اُس نے یار کر پھینکنے کے زور پر بلّے باز کو فُل ٹاس دے دیا۔ بلّے باز نے بلّا گھمایا اور گیند گولی کی رفتار سے باؤنڈری لائن عبور کر گئی۔

کمرے میں تو گویا بھونچال آ گیا۔ سب بچے بڑے خوشی سے ناچنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں آس پاس ہَوائی فائرنگ کی تڑتڑ کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔

قریشی صاحب بھی تھوڑی دیر مسکراتے رہے، پھر سب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا تا کہ میچ کے بعد کی تقریب دیکھی جا سکے۔ اس وقفے کے دوران اشتہارات چلنے لگے۔ یکدم ننھا موجو، قریشی صاحب کی گود میں اُچھل اُچھل کر چیخنے لگا ''فیضی بھائی! فیضی بھائی!'' سب ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سامنے ببلو چیونگم کا اشتہار چل رہا تھا جس میں بچے برف میں ایک سنو مین بنا کر اُس کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ سنو مین کیا تھا ایک بہت بڑے بے ڈھنگے گول مٹول برفانی تودے پر ایک چھوٹا سا گولا رکھ کر اُس پر ایک چونچ لگا دی گئی تھی اور آنکھوں کی جگہ دو چوکور شیشے

دھنسے ہوئے تھے مگر حیرت انگیز طور پر وہ بھالو نما برفانی آدمی فیضی سے مشابہ تھا۔

سب نے پہلے تو ببلو ببل گم کے اشتہار کے برفانی آدمی کو دیکھا، پھر آنکھیں پٹ پٹاتے فیضی کو اور پھر دوبارہ ٹی وی کی جانب دیکھا۔ اس دوران فیضی کو گویا ہوش آ گیا اور اُس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی مگر اُس کی آواز شور میں دَب کر رہ گئی۔ سب کورس میں گا رہے تھے۔

''فیضی بھائی۔ببلو بھائی۔فیضی بھائی۔ببلو بھائی۔''

فیضی نے کچھ دیر تو یہ سب بے بسی سے دیکھا پھر آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔'' مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ اس گھر میں میری بے عزتی خراب ہونی ہے۔''

کافی دِنوں بعد ایک صبح ببلو کے والد کو ضروری کام سے گھر سے جانا پڑ گیا۔ جاتے جاتے وہ ببلو کو بجلی کا بل تھما گئے اور ہدایت کر گئے کہ وہ اسے ہر صورت میں بینک میں جمع کرا دے ورنہ گھر کی بجلی کٹ جائے گی۔ ویسے بھی اُنھوں نے پچھلے ماہ کا بل جمع نہ کرایا تھا اور بجلی کا محکمہ دو ماہ کی عدم ادائیگی کے بعد نادہندہ کی بجلی کاٹ دیتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ہفتے کا آخری دن تھا اور بینکوں کے اوقات ساڑھے بارہ بجے تک تھے اور اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ اُدھر والد صاحب ذمے داری ببلو کے چوڑے کندھوں پر ڈال تو گئے مگر بعد میں سوچتے رہے کہ کیا ببلو یہ کام کر بھی پائے گا یا نہیں۔ اِدھر کچھ احساسِ ذمے داری سے اور کچھ والد صاحب کی جانب سے آزمائش پر پورا اُترنے کی خواہش میں اُس نے کچھ دیر سوچا، پھر دیوار گیر گھڑی کو دیکھا اور صحن میں کھڑی سائیکل پر بیٹھ کر پیڈل تیز تیز چلاتا تا قریب ہی واقع بینک کی جانب روانہ ہو گیا۔

بینک کے باہر کھڑکی کے سامنے بل جمع کروانے والوں کی ایک طویل قطار چیونٹی کی رفتار سے سرک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ببلو کے گول مٹول چہرے پر شکنوں کا ایک جال سا پھیل گیا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ کچھ دیر تو وہ تشویش سے قطار کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے معصوم چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے سائیکل کی قریبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا دی اور

اُسے ایک زنجیر سے قریب ہی واقع درخت سے باندھ دیا۔

شام کو جب والد صاحب گھر لوٹے تو غیر متوقع طور پر ببلو کو باہر صحن میں اپنے انتظار میں ٹہلتے دیکھا۔ والد صاحب کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے ٹھپہ لگا بل اُن کے سامنے لہرا دیا۔ والد صاحب کو اُس کی کامیابی کی قطعی طور پر اُمید نہ تھی۔

''فیضی تم نے بل ادا کر دیا؟''

''جی ابا جی۔ ادا کر دیا۔''

''بیٹا یہ تو میں خود بھی جمع نہ کروا پاتا۔ تُم نے تو کمال کر دیا۔''

''بس ابا جی دُنیا کی ہَوا لگے تو انسان تیز تو ہو ہی جاتا ہے۔''

''مگر بیٹا یہ ہوا کیسے؟''

اس پر ببلو نے ساری بپتا اُن کے گوش گزار کر دی کہ کس طرح وہ جب بینک سائیکل پر پہنچا تو اختتامی اوقات قریب تھے اور پھر کس طرح اس نے پندرہ سو روپے کے بل کے پیچھے پچاس روپے بینک کے سیکیورٹی گارڈ کو بطور رشوت دیے تھے اور اُس نے خود ہی بل کے پیسوں کی ادائیگی کروا کے اُس پر ٹھپا لگوا دیا تھا۔

یہ سُن کر والد صاحب بجائے خوش ہونے کے خاموش سنجیدگی کے غار میں اُتر گئے۔

یہ دیکھ کر ببلو جس کے گول مٹول چہرے پر شوخی بھری فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور گردن تنی ہوئی تھی، پریشان سا ہو گیا کہ کہاں اُس نے اس ہوشیاری سے بل جمع کروایا تھا مگر اِس پر والد صاحب بجائے خوش ہونے کے افسردہ سے ہو گئے ہیں۔

کچھ دیر تو والد صاحب سر جھکائے بیٹھے رہے، پھر جب اُنھوں نے ببلو کی آنکھوں میں جھانکا تو اُن میں بے چارگی دیکھ کر اُنھیں اُس پر پیار آ گیا اور اُنھوں نے بیٹے کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا'' شاباش بیٹا۔ اب لگتا ہے کہ تُم دنیاداری کے قابل ہوتے جا رہے ہو۔ مگر آئندہ کوشش کرنا کہ رشوت کے بغیر ہی کام ہو جائے۔''

یہ سُن کر ببلو خوش ہو گیا اور اُن سے وعدہ کیا کہ آئندہ رشوت کے چکر میں نہیں پڑے گا۔

اِس کے بعد والد صاحب نے والدہ کو آواز دی کہ وہ کھانا گرم کر کے لگا دیں اور صحن کی دیوار

میں نصب واش بیسن کی جانب ہاتھ دھونے کے لیے چل پڑے۔ رستے میں اُنھوں نے ایک اُچٹتی سی نظر دیوار کی جانب ڈالی اور ببلو سے ضمناً پوچھا۔

''بیٹا تم نے سائیکل کہیں باہر تو نہیں کھڑی کر دی؟''

باہر ہمسائیوں میں کوئی گولا چھوٹا۔ ایک دھماکہ ہوا اور آسمان پر پھلجھڑیوں کا ناچ شروع ہو گیا۔ سامنے ببلو ضُم بُکماً کھڑا تھا۔

''وہ وہ ابا جی سائیکل تو میں بینک کے باہر ہی چھوڑ آیا۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ رہے نا نکھٹو کے نکھٹو۔ پندرہ سو کے بل کے پیچھے پچاس روپے رشوت دی اور اڑھائی ہزار کی سائیکل گنوا دی۔ نالائق کہیں کا۔''

اتنے میں آوازیں سن کر والدہ بھی باہر صحن میں آ گئیں۔

سامنے ببلو رونی صورت بنائے کھڑا تھا اور والد اُس پر گرج برس رہے تھے۔ برستے برستے جب وہ بولے۔

''تم واقعی ببلو ہو ببلو۔ ببلو کہیں کے۔''

یہ سُن کر اُسے تو گویا کرنٹ لگ گیا۔ وہ پھٹ پڑا۔ ''غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے ابا جی۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ آپ کبھی میری تعریف نہیں کریں گے۔ ہمیشہ میرے کام میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور نکالیں گے۔ میں نے سائیکل باندھ دی تھی۔ وہ تو میں خوشی میں پیدل ہی واپس چلا آیا۔ سائیکل وہیں ہوگی۔''

''اب زیادہ ٹر ٹر مت کرو اور جا کر سائیکل واپس لاؤ۔ خالی ہاتھ ہوئے تو گھر واپس نہ آنا۔''

یہ سُن کر ماں کا تو گویا کلیجہ ہی کٹ گیا۔ وہ بھاگ کر ببلو کے پیچھے لپکیں لیکن وہ پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد جب صحن کا دروازہ کھلا تو چور چور باپ نے دروازے کی طرف دیکھا۔

ببلو سائیکل کی گھنٹی بجاتا اندر داخل ہو رہا تھا اور اُس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر باپ گویا کھل اُٹھا اور ماں خوشی میں سسکنے لگی۔

وہ ایک عام سا دن تھا۔

چھٹیاں تھیں سو ببلو دیر سے سو کر اُٹھا اور چندھی آنکھوں سے پہلے گھڑی کو دیکھی اور پھر انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔

تھوڑی دیر بستر میں بیٹھا نیند کے خمار میں جھومتا رہا پھر پیروں سے بستر تلے چپل ٹٹولی اور کمرے کی واحد لکڑی کی کھڑکی صحن میں کھول دی۔

باہر کی تازہ ہَوا کمرے میں بھر آئی اور ساتھ میں صحن میں دانہ چگتی مرغیوں کے کُکڑکوں اور ٹھیلے پر آواز لگاتے پھیری والے کی آواز بھی لے آئی۔ دھوپ کی ہلکی تمازت سردیوں کی اس دیر سویر کی ٹھنڈ میں گرماہٹ گھول رہی تھی۔ کھڑکی کھلی تو ساتھ میں اماں نے آواز لگائی۔

''فیضی بیٹا جلدی اُٹھ جایا کرو۔ آج ابا جی غصہ کر رہے تھے کہ مست ملنگ کی طرح پلنگ پر پڑے رہتے ہو اور دن چڑھے اُٹھتے ہو۔''

''اماں چھٹیوں میں تو جی بھر کے سو لینے دیا کریں۔ اب اتنی بھی سختی ٹھیک نہیں۔''

ماں اب کمرے میں چلی آئی۔

''میرے دُلارے میں کب کہتی ہوں کہ ماں کے جگر کو آرام نہ ملے۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ جلدی سو جایا کرو تا کہ صبح سویرے آنکھ کھل جایا کرے۔ ویسے بھی ہم تو تمھیں کہہ کہہ کر تھک گئے ہیں کہ صبح کی نماز پڑھ لیا کرو۔ اُس وقت سورج کی کرنوں کے ساتھ رحمت کے فرشتے اُترتے ہیں اور ایک تُم ہو کہ جو چاہے تُم سے کروالو اِدھر نماز روزے کا نام لیا اور اُدھر تم غائب۔'' ماں کے لہجے میں پیار بھری ناراضگی تھی۔

پھر بات جاری رکھتے ہوئے اماں بولیں۔ ''لو بیٹا تمھارے ابا کا کہنا ہے کہ گھر بیٹھے بیٹھے بچہ ناکارہ ہو جاتا ہے اور ویسے بھی اب اُن کی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ اُن کا بوجھ تمھی نے تو اُٹھانا ہے۔ اس لیے اب گھر کے اور باہر کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹایا کرو۔''

ببلو کے منہ سے ایک دبی دبی سی آواز نکلی۔ ''جی اماں جی۔ کیا کہا ابا نے؟''

''بیٹا وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے مکان کی مدتوں سے سفیدی نہیں ہوئی۔ اگر ٹھیکے پر یہ کام دیا تو بہت مہنگا پڑے گا کیوں کہ ٹھیکے دار خرید میں بھی بچائے گا اور مزدوری میں بھی۔ سو وہ چاہ رہے

تھے کہ تم سفیدی کا سامان خود ہی جا کر بازار سے خرید لاؤ۔"

اتنا کہہ کر ماں نے توقف کیا' پھر بولیں۔ "میں اپنے راج دُلارے پر بوجھ تو نہیں ڈالنا چاہتی مگر وہ کہہ رہے تھے کہ اگر تم ذرا سی ہمت کرو تو سفیدی بھی خود ہی کر ڈالو۔"

"تو گویا اماں وہ مجھے پینٹر بنانا چاہ رہے ہیں۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ اگر یہی کام کروانا ہے تو اُن کو بتا دیجیے گا کہ فلمی بورڈ پینٹ کرنے کا زیادہ معاوضہ ملتا ہے۔ کیوں نہ یہی کام کرلوں۔"

ماں کے منہ سے بے اختیار آواز نکلی۔ "توبہ کرو بیٹا۔ منہ سے کوئی اچھی بات نکالتے ہیں۔ ایک نمازی کا بیٹا ایسا کام کرنے کا سوچے بھی کیوں۔ بس بیٹا تمھارے ابا چاہتے ہیں کہ تمھارے اندر جلدی جلدی احساسِ ذمے داری پیدا ہو جائے۔ اس لیے کبھی کبھی سختی بھی کر گزرتے ہیں۔ اب بیٹا خود ہی سوچو کہ اگر آج شام جب وہ گھر آئیں گے تو باہر ورانڈے کی دیوار پر سفیدی ہوئی دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے۔"

والد صاحب کے خوشی سے تمتماتے چہرے کا سوچ کر ببلو نے سر جھکا دیا۔

صبح کا سامان خریدنے نکلا ببلو جب دوپہر تک واپس نہ آیا تو ماں کا دِل غصے سے بھر گیا۔

"بیٹھ گیا ہوگا دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکنے۔"

دوپہر کی کبھی چلچلاتی کبھی ٹھٹھرتی دھوپ شام کے ابتدائی سایوں میں تبدیل ہونے لگی۔ آسمان پر کوؤں کا شور بھی بڑھ گیا۔ نیلے آسمان پر تیرتی چیلیں گویا سلوموشن میں آسمان پر معلق تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھار چند چیلیں ہَوا میں ڈُبکی لگاتیں اور ہمسائے کے کسی گھر کی چھت پر ڈالے گئے صدقے کے گوشت پر جھپٹ پڑتیں۔

ماں نے تلملا کر سوچا۔ "یہ بچہ تو کسی کام کا نہیں۔ اب اس کے ابا گھر آ کر اس کی جو درگت بنائیں گے تو ساتھ میں مجھ سے بھی ناراض ہوں گے کہ ناحق اِس کا ساتھ دیتی ہوں۔"

اتنے میں ساتھ کی منڈیر سے ایک کوا اُڑا اور اماں کے سر پر بیٹ کرتا گزر گیا۔ شام کا وقت اور

ایک منحوس پرندے کی یہ پلید حرکت۔

''یہ تو اچھا شگون نہیں۔ کم بخت نے ناپاک کردیا۔ اوپر سے شام کے سائے اُتر رہے ہیں۔ دو وقت مل رہے ہیں۔''

مگر اِس بات کو اماں نے ایک غیر ضروری وہم سمجھ کر نظر انداز کردیا اور غسل کرنے کے لیے صحن سے ملحق غسل خانے کی جانب چل دیں۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔

اماں کے دل پر وہم کا خوف ناک آسیب قابض ہونے لگا۔ اتنے میں اطلاعی گھنٹی بجی۔

اماں کی جان میں جان آئی۔ بے اختیار وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئیں اور تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھیں۔

''ایک تو اس نابکار کے خوب کان کھینچوں گی کہ ماں کو ستا کر اسے کیا ملتا ہے۔''

دروازہ کھولا تو ہمسائے سے بانو آپا سامنے کھڑی تھیں۔ اُن کے ہمراہ اُن کا بیٹا اور فیضی کا دوست خورشید بھی تھا۔ اُن دونوں کے چہروں پر سنجیدگی تھی۔

''خیر تو ہے آپا۔ آپ کچھ پریشان سی دِکھتی ہیں۔ اندر تو آئیے۔''

''بس بہن خورشید کے کہنے پر چلی آئی ہوں اندر نہیں آؤں گی۔ وہ دراصل شاید تُم نے ٹی وی نہیں دیکھا۔ آج دوپہر صدر بازار میں بم کا دھماکہ ہوا ہے۔ ایک شخص ہلاک اور چار پانچ زخمی ہوئے ہیں۔ خورشید بتا رہا تھا کہ صبح ہلو اسے ملا تھا۔ وہ سفیدی اور روغن کا سامان لینے جا رہا تھا۔ اِسے کہا تھا کہ جلد ہی آ جائے گا۔ پھر دونوں مل کر تمھارے گھر میں سفیدی کردیں گے۔ اس کے بعد وہ سامان لینے صدر بازار کو چلا گیا۔''

اب تک اماں کا چہرہ فق ہو چکا تھا اور جسم پر لرزہ طاری ہو چکا تھا۔

''بہن میرے منہ میں خاک مگر میں تو صرف اپنے بچے ہلو کی خیریت دریافت کرنے آئی ہوں۔''

اماں ہوش میں ہوتیں تو بانو آپا کا سوال سُنتیں اور کوئی جواب دیتیں۔

سر پر پتھر کوٹنا کسے کہتے ہیں اور جوان اولاد کی گمشدگی کا غم کیا ہوتا ہے یہ بات تو تبھی دونوں جان پائے۔

مردہ کے کفن کو چہرے سے ہٹایا اور زخمیوں کا جائزہ لیا تو اماں اور ابا کی تسلی ہوئی کہ اُن کا جگر گوشہ بلو زندہ ہے کہ وہ ان میں نہ تھا۔ مگر وہ گیا کہاں اُس کی کوئی خبر نہ ہوئی۔

مساجد سے اعلان کروائے گئے، اخبار میں تلاشِ گمشدہ میں اشتہار دیا گیا کہ اٹھارہ برس کا بچہ ہے، ذہنی توازن قائم نہیں، سو جس کو ملے گھر پہنچا دے۔

ذہنی توازن درست ہوتا تو خود ہی چل کر گھر نہ آ جاتا۔

چوتھے روز تو اماں کو باقاعدہ غشی کے دورے پڑنا شروع ہو گئے۔ ابا بھی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔ بہت سوچا کہ کہیں ناراض ہو کر تو نہیں چلا گیا مگر کچھ سوجھی نہیں کہ اگر ناراض ہوا ہے تو کس بات پر۔ بالآخر اخبار میں دوبارہ اشتہار دیا گیا کہ اگر کسی کو کچھ معلوم ہو تو بتائے اور اگر خود پڑھے تو گھر آ جائے۔ اور پھر انعام بھی رکھا گیا۔ اِن سات دِنوں میں اماں ابا گویا ستر ستر برس کے ہو گئے۔ چہرے مرجھا کر اور جسم کمہلا کر رہ گئے۔ اماں تو باقاعدہ رعشے کی مریضہ ہو گئیں۔ رو رو کر اُن کی آنکھیں سُوج گئیں۔ ابا سب کے سامنے تو خاموش رہتے اور صبر کا دامن نہ چھوڑتے مگر ایک روز غسل خانے میں بند ہو کر اُن کے سسکنے کی آواز سن کر اماں بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

نا اُمیدی مایوسی میں بدلنے لگی۔

محلّہ دار جو شروع میں خیریت اور تازہ خبر معلوم کرنے آتے تھے اب تعزیت کے لیے آنا شروع ہو گئے۔

ایک روز شام کا وقت تھا، اور یہ دھماکے کے تیسرے ہفتے کی بات ہے کہ دھڑام سے دروازہ کھلا اور عجب ہیئت کا ایک شخص صحن میں داخل ہوا۔

اماں ڈر گئیں اور ابا جلدی سے کمرے سے باہر نکلے اور اُس شخص کو غور سے دیکھا۔

اماں اور ابا کی مشترکہ آوازیں فضا کو ریزہ ریزہ کر گئیں۔

وہ بلو تھا۔ اُن کا جگر گوشہ۔ اُن کا راج دُلارا۔

اماں سسکتی ہوئی اُس سے جالگرائیں اور لپٹ کر اُس کا چہرہ چومنے لگیں۔

اُس کے چہرے پر نیل کے نشان تھے اور ایک آنکھ سُوجی ہوئی تھی۔ ہونٹ ایک کونے سے پچکا ہوا تھا اور ہر قدم پر اُس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکلتی تھی۔ اُسے فوراً بستر پر لٹایا گیا اور گرم دودھ میں دیسی گھی اور شکر گھول کر پلائی گئی۔

دودھ پی کر وہ سو گیا۔ مگر سونے سے پہلے اُس نے بتایا کہ وہ دھماکے کے بعد سے صدر تھانے میں تھا اور دھماکے میں ملوث مشکوک لوگوں میں شامل تھا اور یہ کہ زیرِ تفتیش تھا۔

وہ دو روز تک سوتا رہا۔ جب اُٹھتا بس خلا میں گھورتا رہتا اور پھر کھا پی کر دوبارہ سو جاتا۔ ماں نے دھودھو کر زخم صاف کیے اور مرہم پٹی کی۔ کوئی ایک ہفتے بعد وہ کچھ ہوش میں آیا۔

مگر یہ اماں ابا اور محلے والوں، کسی کی بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُسے شاملِ تفتیش کیوں کیا گیا۔ اگر وہ جائے وقوعہ سے بھاگا تھا تو سبھی بھاگے تھے۔ پھر اُس کا کسی مذہبی تنظیم تو کجا، مذہب کی جانب ہی خاص میلان نہ تھا۔

جب اُس سے پوچھا جاتا تو وہ تذبذب میں ہکلاتا یا تو ٹال جاتا یا پھر لاعلمی کا اظہار کر دیتا۔

اس واقعے کے کئی ہفتے بعد کی بات ہے۔

خورشید اور بلو رات کے کھانے کو اکٹھے نکلے۔

نرم نرم ہَوا بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی اور لطیف مہک ماحول کو معطر بنا رہی تھی۔ دونوں بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔

اُس روز بلو پہلی بار اپنی اصل فارم میں واپس آیا تھا۔ کھانے کے بعد دونوں چہل قدمی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ چہلیں کرتے ٹھٹھے مارتے اور لطیفے سناتے یکدم خورشید بول اُٹھا۔

''یار بلو اب صحیح صحیح بتا۔ اپنے یار کو تو صحیح بتا دے کہ اُس روز کیا ہوا تھا؟''

بلو کی آنکھوں کے سامنے ساری تصویر کھنچ گئی۔ وہ جھجک کر رہ گیا۔ اُس کی جھجک دیکھ کر

خورشید کا شک یقین میں بدل گیا کہ کوئی بات ہے ضرور جو ببلو اُس سے چھپا رہا ہے۔

''ببلو تو نے مجھے یار نہیں بھائی بنایا تھا۔ اور وہ بات جو اماں ابا سے بھی چھپالی جائے وہ بھائی کو بتا دی جاتی ہے۔''

ببلو جھینپ کر رہ گیا۔ پھر کچھ دیر توقف کے بعد رُک رُک کر بولا۔ ''یار شرم آتی ہے۔ بات ہے ہی اتنی چھوٹی سی۔''

خورشید کو اور شہ مل گئی۔ وہ اور شیر ہو گیا اور بار بار اصرار کرنے لگا۔

اِس پر ببلو نے دھیمی آواز میں بات شروع کی۔ ''یار بات یہ ہے۔ بات یہ ہے۔''

''اب بول بھی۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ اُس روز سفیدی اور روغن کا سامان خریدنے جب میں بازار پہنچا ہی تھا کہ دھماکہ ہو گیا۔ اب تجھے ہمارے ملک اور شہر کے حالات تو اچھی طرح سے معلوم ہیں۔''

ببلو نے کچھ دیر توقف کیا اور بات کی ڈور کا سرا پھر سے تھام لیا۔ ''تو جب دھماکہ ہوا اور سب لوگ جائے وقوعہ کی طرف بھاگے تو میں بازار سے باہر بھاگا۔ تجھے معلوم تو ہے کہ مجھے تو پتا خوں سے بھی کتنا ڈر لگتا ہے۔''

''مگر وہ بات بتا جو اس سارے مسئلہ کی جڑ ہے۔''

تجسس اب خورشید کے لیے نا قابل برداشت ہو رہا تھا۔ اُس کا تجسس دیکھ کر ببلو گویا ہوا۔

''اسی دوران قریبی تھانے سے پولیس بھی باہر نکل آئی۔ اور دھماکے کے موقع کی جانب لپکی۔ میری جو شامت آئی تو میں نے بے ساختہ عادتاً ساتھ میں کھڑے شخص سے بول دیا۔''

''وہ کیا؟''

''مجھے تو پہلے ہی سے پتا تھا کہ یہ دھماکہ ہونا ہے۔''

''پھر؟''

''وہ سالا سادہ کپڑوں میں خفیہ پولیس والا تھا۔''

اس پر کچھ دیر کے لیے خورشید اور ببلو کے درمیان خاموشی کا وقفہ حائل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب خاموشی کا پردہ اُٹھا تو خورشید کے بلند بانگ قہقہے پر غصے سے ببلو کا چہرہ

سرخ ہو گیا اور وہ بے اختیار یہ بول کر وہاں سے چل دیا۔ ''مجھے پہلے سے پتا تھا خورشید کہ تو دوست کی کینچلی میں ایک زہریلا سانپ ہے۔''

ایک نفسیاتی مسئلہ

وہ سردیوں کی ایک اجلی صبح تھی۔ میں ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ کر کے فارغ ہوا تھا اور کھڑکی سے باغیچے میں دیکھتے ہوئے سگریٹ کا پہلا آسودہ کش لگایا ہی تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے دروازہ ذرا سا کھول کر درز سے اندر جھانکا۔ میں جھلا گیا۔ نہ جانے کون اس لمحے میری آسودہ فراغت میں مخل ہوا تھا۔ بہرطور میں نے کھنکار کر دروازہ کھولنے والے کو اندر آنے کا کہا۔ دروازہ کھلا تو سامنے درمیانی عمر کے ایک مہذب صاحب نیم شرمندہ سی جھجھک سے اندر داخل ہوئے۔ اُن کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ لباس نفیس اور تازہ دھلا ہوا دکھتا تھا۔ سنہرے فریم کا نازک سا چشمہ لگائے وہ کسی بینک کے عہدہ دار یا کسی ایسے پیشے سے وابستہ لگتے تھے جس میں جسمانی مشقت یا کاروباری طراری کا زیادہ دخل نہ ہو۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں مخاطب ہوئے'' آپ یقیناً طرابلس صاحب ہیں۔ معذرت خواہ ہوں، آپ کے معمولات میں مخل ہوا۔ دراصل میں کافی دیر سے رسالے کے دفتر میں چپڑاسی یا چوکیدار کو ڈھونڈ رہا تھا مگر سارے کمرے خالی تھے اسی لیے آپ کو زحمت دی۔''

میں سپاٹ لہجے میں بولا'' جی، میں طرابلس ہوں۔ چوکیدار کو میں نے سامنے کینٹین پر

چائے لینے بھیجا ہے۔ باقی رہا آپ کا تعارف تو وہ آپ پر ابھی قرض ہے۔"

"مجھے مستقیم کہتے ہیں۔ اپنے آپ کو آپ کے خاموش مداحوں میں شمار کرتا ہوں۔ انسانی نفسیات اور جبلت پر آپ کی تازہ کتاب چند روز پہلے ہی پڑھی ہے اور بار بار پڑھی ہے۔ کیا شاندار کاوش ہے۔" ان صاحب کے لہجے میں ستائش تھی۔

اب مجھے اپنے سرد رویئے پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ میں نے متانت سے جواب دیا "جی مستقیم صاحب! آپ کی بہت نوازش ہے جو میری حقیر کوشش آپ کو پسند آئی۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں بلکہ یہ آپ کا حُسنِ نظر ہے۔"

اتنے میں میراں بخش چائے لے کر آ گیا۔ چائے کا ایک اور کپ لانے کا کہہ کر میں ان صاحب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں ایک جھجک نمایاں حد تک جھلک رہی تھی۔ نظریں ملیں تو وہ نظر چراتے ہوئے گویا ہوئے۔ "دراصل میں بہت دِنوں سے تذبذب کا شکار تھا۔ دوست بہت ہیں مگر انسانی نفسیات پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں۔ آخر کار آپ کی تازہ کتاب پڑھ کر سوچتا رہا کہ آپ سے ذاتی مسئلہ بیان کروں یا نہیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ طبیب اور پادری کے سامنے سب کچھ بیان کر دینا چاہیے اور آپ ٹھہرے نفسیاتی طبیب۔ پھر آپ کے مضامین میں علم کے ساتھ انسان دوستی جس طرح نظر آتی ہے اس سے آپ کے ہمدردانہ مزاج کی بہت خوبصورت تصویر سامنے آتی ہے۔ اسی لیے آپ سے زیادہ موزوں شخص کوئی اور نظر نہیں آیا، سو چلا آیا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں کہ بلا تعارف مخل ہوا ہوں مگر آپ سے یہ مسئلہ بیان کرنے سے شاید میرا بوجھ کم ہو جائے اور حل کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔"

میں نے انہیں تسلی دی "فرمایئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔ بلا جھجک بتایئے کہ آپ کو کس نوعیت کا نفسیاتی مسئلہ لاحق ہے۔ شاید میں آپ کے کام آ سکوں۔"

مستقیم صاحب نے ادھر ادھر دیکھا اور بولے "بات کچھ ذاتی ہے اور آپ پر اعتماد کر رہا ہوں۔ اگر مکمل تنہائی میسر آ جائے تو شاید یکسوئی سے گفتگو ہو سکے۔"

میرا تجسس بڑھ چکا تھا۔ اتنے میں میراں بخش چائے لے آیا۔ اسے خاص ہدایت دے کر کہ کوئی مخل نہ ہو، میں مکمل طور پر ان صاحب کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔ "گھبرایئے نہیں۔ دل

دریا سمندروں ڈوبنگے۔ مجھے اپنا ہی خیال کیجئے۔ اور ہاں اگر سگریٹ سے شوق رکھتے ہوں تو تکلف مت کریں۔ مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔''

''طرابلس صاحب! میں اب تک پُراعتماد نہیں کہ آپ سے یہ بات کرنا چاہیے یا نہیں، لیکن ایک ہمدرد طبیب جان کر آپ کے سامنے دل میں جو کچھ ہے الٹائے دیتا ہوں۔'' وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔

وہ بول رہے تھے'' مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ لڑکی میرے حواس پر اس بری طرح چھا جائے گی۔ اس نے تو مجھے اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جیسے---- جیسے یوں سمجھیں کوئی بحری طوفان کسی بادبانی کشتی کو لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں تک جا پہنچی۔ کہاں وہ میری سٹوڈنٹ تھی اور کہاں اس نے مجھے خود میرے اپنے خوابیدہ جذبات کے بارے میں اس طرح سکھایا کہ میں اس کے سامنے ایک شاگرد سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔ شروع میں میں اسے اپنی فتح سمجھتا رہا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو میری شکست تھی۔''

بات اب تک غیر واضح تھی۔

''دیکھئے صاحب! بات اگر ترتیب سے ہو جائے تو شاید زیادہ واضح ہو۔'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

کچھ توقف کے بعد وہ بولنے لگے''طرابلس صاحب! میں ایک بینک میں ملازم ہوں۔ جب سے یہ پرائیویٹ کالج کھلے ہیں تو سوچا تھا کہ کسی کالج میں شام کو لیکچر دے دیا کروں۔ ایک تو اضافی آمدنی ہو جائے گی۔ اوپر سے نئے علوم سے بھی آگاہی رہے گی۔ ایک کالج نے مجھے بخوشی شام کو لیکچر کے لیے دعوت دے دی۔ ایک برس تو خیر خیریت سے گزر گیا، مگر اب کے جو جماعت آئی تو اس میں وہ بھی تھی۔ بالکل عام سی لڑکی۔ بس اس میں کوئی خوبی تھی تو وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ کوئی خاص خوبصورت آنکھیں نہ تھیں۔ مگر جو شے قیامت ڈھاتی تھی وہ ان آنکھوں میں جھلکتا بلاوا تھا۔ خدا کی پناہ! ایسا بلاوا تھا کہ میں اس کی طرف اس بری طرح کھنچتا چلا گیا جیسے شکار اژدہے کی آنکھوں کے مقناطیسی حصار میں بے سدھ گھسٹتا چلا جاتا ہے۔ بہت کوشش کی کہ لیکچر کے دوران اس کی جانب نہ دیکھوں۔ مگر انسان نے عجیب مزاج پایا ہے کہ جس شے سے اپنے آپ

کو جتنا منع کرتا ہے، اتنی ہی اس شے میں کشش بڑھ جاتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کے تحت الشعور میں بچپن کی کوئی نا آسودہ خواہش کلبلا رہی تھی۔" میں سوچتے ہوئے بولا۔

"یہ تو آپ ہی بہتر جان سکتے ہیں۔ مگر میں اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ ایسی لالچی اور ہوس ناک نظریں میں نے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ مگر ان آنکھوں میں صرف لالچ نہ تھا، پا لینے کا عزم بھی تھا۔"

میں نے بات کاٹی" آپ کو کیا شے اس کی جانب مبذول ہونے سے روکتی تھی۔ استاد کے رشتے کا تقدس حائل تھا یا کوئی اور وجہ تھی؟"

وہ ہکلاتے ہوئے بولے" ہاں شاید کوئی موہوم سی رکاوٹ تقدس کی بھی ہوگی مگر اصل وجہ میری بیوی اور بچے تھے۔ میں دلی طور پر اپنی بیوی سے مخلص رہا ہوں اور بچوں میں تو میری جان ہے۔ میں شریف آدمی ہوں اور خاندانی ذمہ داریوں میں اضافے سے تو اور بھی محتاط ہو گیا ہوں۔" مستقیم صاحب کی آواز میں دبا دبا سا احساس جرم تھا۔" میں واقعی اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہوں۔ جب سے میری شادی ہوئی ہے اس نے میری خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور وفا شعار بھی بلا کی ہے۔ بچوں کی بھی اس طرح سے پرورش کر رہی ہے کہ شاید کوئی اور مثالی ماں بھی نہ کرے۔ میں تو اپنی ماں کی دی گئی مثالی پرورش سے ہی بیوی کا موازنہ کر سکتا ہوں۔ میری بیوی یقیناً ایک باکمال عورت ہے۔"

"آپ کے لاشعور میں عورت سے غیر ضروری طور پر مرعوب ہونے کا عنصر نمایاں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ جنسی طور پر کمزور واقع ہوئے ہیں اور یہی احساس بے چارگی آپ کو عورت ذات سے غیر ضروری طور پر متاثر ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ خیر آگے فرمایئے۔"

میں ساتھ میں تمام نفسیاتی پہلوؤں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ انہوں نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بات جاری رکھی۔" مگر وہ تو باقاعدہ طور پر مجھ پر توجہ کرنے لگی۔ ایک روز جب شام کی کلاسوں کے بعد سب لوگ جا چکے تھے اور میں کالج کے ڈرائیور کا انتظار کر رہا تھا جو میری سوزوکی ٹھیک کروانے گیا ہوا تھا کہ وہ یکدم کہیں سے آئی اور میرے برابر بنچ پر آن کر بیٹھ گئی۔ پھر بڑے

ادب سے مجھے بتانے لگی کہ کس طرح وہ میرے طرز تدریس سے متاثر ہے۔ میں نے جان چھڑانے کی سعی کی۔ مگر وہ انجان بنی رہی۔ پھر آہستہ سے میرے ہاتھوں کو چھوتے ہوئے لجاجت سے درخواست کرنے لگی کہ میں اسے کالج کے بعد بطور خاص اس مضمون کی ٹیوشن پڑھا دیا کروں۔''

''اور آپ نے ٹیوشن شروع کر دی۔'' میں نے لقمہ دیا۔ میں اندازہ کر چکا تھا۔

وہ گویا ہوئے ''طرابلس صاحب! بات یہیں تک نہیں ہے۔ عام حالات میں شاید میں اسے پڑھانے پر راضی نہ ہوتا مگر اس کا جو چھونا تھا وہ مجھے لے بیٹھا۔ کرنٹ تھا اس لمس میں۔ کبھی چھوا ہے آپ کو کسی عورت نے؟''

مجھے باقاعدہ غصہ آ گیا۔ ''سینکڑوں نہیں تو درجنوں ضرور ہوں گی۔ شادی شدہ بھی ہوں اور باقاعدہ قانونی طور پر والد بھی ہوں چار بچوں کا۔ اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کمال اپنی بیوی کو چھوئے بغیر ہی ہو گیا ہے تو آپ نہ صرف احساس کمتری کا شکار ہیں بلکہ آپ کو یقیناً دن میں کئی بار ہاتھ دھونے کی عادت بھی ہو گی۔ معمولی خبطی لوگوں میں یہ عادت راسخ ہوتی ہے۔''

''آپ تو ناراض ہو گئے۔ میں نے تو فقط محاورتاً کہا تھا۔'' ان کا لہجہ معذرت بھرا تھا۔

میں خاموش رہا اور سر ہلا دیا۔

''وہ کرنٹ تھا یا نہیں یہ میں نہیں جانتا۔ بچپن میں ایک بار ہی کرنٹ پڑا تھا جب ننگی تار کو چھو لیا تھا۔ اُس کا اثر چند لمحے رہا تھا۔ مگر اِس کا اثر تو آج بھی زائل نہیں ہوا۔ خیر اب تو شائد عادت بھی ہو گئی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس رات میں لیٹا تو اپنی بیوی کے ساتھ تھا مگر ذہن اسی میں اٹکا ہوا تھا۔ ایسی کیفیت سے تو میں اپنی پوری ازدواجی زندگی میں دوچار نہ ہوا تھا۔ ساری رات بخار میں پھنکتا رہا۔ صبح اٹھ کر بیوی نے اس کیفیت کا پوچھا تو کہہ دیا کہ شاید ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ کر بولی کہ اب تک حرارت ہے۔ مگر اللہ کی اس سادی بندی کو کیا معلوم تھا کہ اصل تاپ تو جسم کے اندر تھا باہر کہاں۔''

''گویا آپ عشق کے پہلے ہی تیر سے ڈھیر ہو گئے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں صاحب یہ تیر نہ تھا، جادو تھا۔ بنگالی جادو تھا یا شاید سامری یا پھر سفلی علم کی کوئی قسم

جو مارتی بھی ہے اور مرتے کو پانی بھی نہیں پینے دیتی۔"

"بات آگے بڑھائیے۔" میں ہمہ تن گوش تھا۔

"میں عزت دار آدمی ہوں۔ بدنامی سے ڈرتا تھا اس لیے اسے کہہ دیا کہ ٹیوشن وغیرہ نہیں پڑھا سکتا۔ اس کا اصرار جاری رہا تو ایک دوست سے بات کر کے اس کے خالی فلیٹ کی چابی حاصل کر لی اور لڑکی کو کہہ دیا کہ وہاں آ کر ٹیوشن پڑھ لیا کرے۔ شریف آدمی ضرور ہوں مگر بے مروت نہیں۔"

میں جھلا گیا۔" آپ اپنی خوبیوں پر زور کم دیجیے اور اصل موضوع کی طرف آیئے۔"

وہ خاموش سے ہو گئے۔" اگر آپ نہیں سننا چاہتے تو مجھے پہلے ہی بتا دیتے۔"

"نہیں نہیں آپ غلط سمجھے ہیں۔ چلئے جو چاہے بولیں میں پوری طرح متوجہ ہوں۔"

وہ کھنکار کر بولنے لگے۔" جب وہ پہلی مرتبہ بے لباس ہوئی تو میں تو دم بخود رہ گیا۔ غضب ہو گیا۔ اتنا متناسب جسم، وہ قیامت کا سراپا۔ اجی جناب قیامت کا سنا ضرور تھا، مگر اس لمحہ اسے دیکھ بھی لیا۔ اور وہ بھی بے لباس۔ پہلی مرتبہ تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر چھو بھی نہ سکا۔"

"ہاں ایسا ہوتا ہے کبھی کبھار۔ میرے ساتھ تو مختلف عورتوں کے حوالے سے بارہا ایسا ہوا ہے۔ انسان وفور جذبات اور یکدم جھٹکے کی شدت سے سن ہو کر رہ جاتا ہے۔ حساس لوگوں میں یہ بات عام ہے۔" میں ٹھوڑی پر کھجلی کرتے ہوئے بولا۔

"خیر میرا تو پہلا تجربہ تھا۔ آج تک اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت کو چھوا تک نہ تھا۔ کہاں وہ زہد اور کہاں یہ افتاد۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ وہ ایک مرتبہ بھی نہ شرمائی تھی اور نہ ہی جھجھکی تھی۔ بس مجھے چھوتے ہوئے بولی تھی 'مستی'---ہاں وہ پیار سے یہی کہتی ہے آج بھی----' آپ کو تو میں مرد سمجھی تھی۔ مگر آپ تو----" مستقیم صاحب بولتے بولتے رک گئے۔ پھر کھنکار کر بولے" خیر چھوڑیے۔ آپ خود ہی بتائیے کہ میں کتنا انکار کر سکتا تھا۔ کہاں میری گھریلو بیوی چار بچوں کی ماں اور کہاں وہ بائیس چوبیس برس کی کنواری۔"

"کنواری کا مطلب جانتے ہیں آپ؟" میں نے جملہ بیچ سے اچک لیا۔

''وہ جھنجھلا گئے'' میں نے محاورتا کہا تھا۔ ایک تو آپ بال کی کھال اتارنے پر بضد ہو جاتے ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ کہاں وہ بائیس چوبیس برس کی لڑکی۔ تنے ہوئے بدن، کسے ہوئے اعضا والی۔''

مجھے حسد سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بول رہے تھے۔

''مگر اصل بات جسم کی نہیں ہے قرطبہ صاحب۔''

''قرطبہ نہیں طرابلس۔'' میں نے انہیں درست کیا۔

''ہاں ہاں ایک ہی بات ہے۔ اصل چیز بدن نہیں ہے اس کی ادائیں ہیں اس کے پیار بھرے چونچلے ہیں۔ میری بیوی کو تو یہ چیزیں پہلے دن سے ہی نہیں آتی تھیں۔ ٹھیک طرح سے میک اپ تک تو کرتی نہیں۔ اور ہم جب ملتے بھی ہیں تو وہ اسے فرض سمجھتی ہے۔ اور سچ پوچھیں تو میں بھی فرض ہی سمجھتا ہوں۔ اور فرائض کی ادائیگی میں پہلے جہاں دو چار دن کی کوتاہی ہو جاتی تھی، اب وہاں ہفتوں اُن کی طرف توجہ ہی نہیں جاتی۔''

مستقیم صاحب کا اپنی خانگی مصروفیات پر رواں تبصرہ جاری تھا۔ ''طرابلس صاحب آپ کیا جانیں اس کے ناز و ادا۔ اتنے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہے ان کو انگلیوں میں لپیٹ لیتی ہے اور آہستہ آہستہ چھوڑتی ہے۔ میرے بالوں میں کنگھی بھی خود کرتی ہے اور قمیض کے بٹن بھی اپنے ہاتھوں سے بند کرتی ہے۔ اس طرح سے میرے ناز اٹھاتی ہے اور اٹھکیلیاں کرتی ہے جیسے کوئی نو بیاہتا جوڑا ایک دوسرے کے جسموں کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہو۔ میرے سینے کو میرے بچے کے سوا کسی نے نہیں چوما تھا۔ اب تو میں بنیان پہنے بنا سوتا ہی نہیں کہ کہیں میری بیوی کو کوئی خراش، کوئی نشان نہ دکھ جائے۔'' ان کے لہجے میں ندامت تھی۔

''مگر مستقیم صاحب اب مسئلہ کیا ہے آخر؟'' میں نے پوچھا۔

''مسئلہ بہت گھمبیر ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔'' وہ گلوگیر لہجے میں میں بولے۔

''فرمائیے۔ مجھے اپنا سمجھئے۔ میں ضرور آپ کی مدد کروں گا۔'' میں نے پیشکش کی۔

''وہ ہچکچا کر بولے'' اس نے مجھے اپنا اتنا عادی بنا لیا ہے کہ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''تو پھر شادی کرنا چاہتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

ارے نہیں جناب، بالکل بھی نہیں۔ یہ بات تو ہمارے درمیان طے ہے۔''

''پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ جب میں اس کے پاس ہوتا ہوں تو مجھے اپنی بیوی اور بچے یاد آنے لگتے ہیں۔ میرے اندر کا احساس جرم جاگ اٹھتا ہے۔ اپنی وفا شعار بیوی میری نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ معصوم بچوں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو قتل کے مجرم سے بھی زیادہ گنہگار سمجھنے لگتا ہوں۔ میرے پیار میں رکاوٹ سی آتی جارہی ہے' مگر جب میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہوں تو مجھے وہ بے طرح یاد آتی ہے۔ اس کے انداز، اس کے نخرے' اس کا گٹار کے تاروں کی طرح تنا اور سنگ مرمر کی یونانی دیویوں کی طرح بھرا جسم، اس کی پر ہوس نظریں۔''

''یعنی آپ دو دنیاؤں کے بیچ میں ہیں۔ دو کشتیوں کے مسافر ہیں۔ کسی نادیدہ محرومی نے آپ کو قوت فیصلہ سے محروم کر دیا ہے۔''

''لیکن بتایئے اب میں کیا کروں۔ جب تک اس کے متعلق نہ سوچوں جسمانی طور پر اپنی بیوی سے بھی فرائض کی ادائیگی نہیں کر پاتا۔ اس کا تصور ہی میرے لیے حیات آفریں ہوتا ہے۔ میرے سوئے جذبات کو جگا دیتا ہے۔ مگر پھر اس کا ساتھ میرے احساس جرم کو بھی ہوا دیتا ہے۔ اب میں نہ اس کشتی کا مسافر ہوں نہ اس کا۔ یہ سلسلہ کب تک یونہی چلے گا۔ خدارا مجھے اس کا کوئی حل بتایئے۔''

''آپ نے اسے کب ملنا ہے؟''

''آج کی شام۔ کالج میں چھٹی ہے لیکن میں نے بیوی کو یہی بتایا ہوا ہے کہ کالج میں میرا لیکچر ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ بے شک آج آرام سے جایئے۔ میں اس پر غور کرتا ہوں۔ آخر آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد کیا ہے تو میں اس کے ممکنہ حل کا ضرور سوچوں گا۔ آپ دو روز تک میرے پاس آیئے گا۔ تب تک میں اس پر ہر پہلو سے غور کر رکھوں گا۔ آپ کا احساس جرم اور پھر صرف اسی

کے تصور سے جذبات جاگنے کا سلسلہ قدم بہ قدم نہیں چل سکتے۔ آج نہیں تو چند برس بعد یہ آپ کے لیے نا قابل حل نفسیاتی دشواریاں لے کر آئے گا۔"

مستقیم صاحب آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ میرا محبت سے شکریہ ادا کیا اور نڈھال قدموں سے دو روز بعد آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ میں تاسف سے ان کو جاتے دیکھتا رہا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے میراں بخش کو ایک کپ گرما گرم چائے لانے کا کہا اور فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔"

میں بولا۔ "وہ آئے تھے۔ تمہارا شک درست تھا۔"

"اچھا تو وہ بُدھُس آئے تھے۔ مجھے یقین تھا وہ ضرور آئیں گے۔ مجھے تو کئی دنوں سے شک تھا مگر وہ تو جلیبی کی طرح سیدھے ہیں۔ اسی لیے تمہاری کتابیں لا کر اُن کے سرہانے رکھ دی تھیں۔ پوچھتے تھے 'جان تم نے کب سے نفسیات پڑھنی شروع کر دی؟' کوئی نہ کوئی بہانہ کرنا ہی پڑتا تھا۔ خیر میں نے تمہاری کتابوں کی بہت تعریف کی تھی۔"

"کہیں ہماری تو نہیں کر دی۔" میں اٹھلا کر بولا۔

"اوہ نہیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ ضرور جائیں گے تمہارے پاس۔ شہر کا کوئی عامل، دست شناس اور بہروپیا تو چھوڑا نہیں۔ کئی دنوں سے رٹ لگا رکھی تھی' کاش کہ کوئی اچھا نفسیاتی ماہر مل جائے۔' پوچھتی تھی' کیوں؟ تو ٹال جاتے تھے کہ' ایک دوست کو ملانا ہے' مگر مجھے معلوم تھا کہ خود ہی ملنا ہوگا۔ پچھلے چند ہفتوں سے عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگ گئے تھے۔ خوب نہانا دھونا۔ پہلے تو ہفتہ ہفتہ بھر بے دھلے موزے بنیانیں پہنی جاتی تھیں۔ اب یکدم روز نئے دھلے موزے بنانیں پہننے لگ گئے تھے۔ مجھے تو شاید شک نہ پڑتا کہ آخر کون قسمت ماری اُن بے چارے پر توجہ دے گی۔ مگر جب سے ریشمی انڈرویئر گھر میں آنے شروع ہوئے اور وہ بھی خوشبو چھڑک چھڑک کر پہنے جانے لگے تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے یہ منصوبہ بنایا۔ ویسے بھی میرا تم سے زیادہ اچھا دوست کون ہو سکتا ہے؟"

"اچھا واقعی؟" میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

''اب جومت۔اور ہاں یہ بتاؤ کہ اُن کا منصوبہ کیا ہے؟''

''ارے آج کے منصوبے کی فکر مت کرو۔تم آؤ' میں سب کچھ تفصیل سے بتادوں گا۔ آج وہ گئے ہوئے ہیں۔ہم آج مل سکتے ہیں۔''

''اچھا آ آ۔میں تو آج مصروف ہوں۔'' دوسری طرف نسوانی لہجے میں لاڈ امڈ آیا۔

''اب چھوڑو بھی۔شام پانچ بجے وہیں اسی فلیٹ میں آجانا۔اور ہاں میری کتابیں واپس لیتی آنا۔''

''آنا ضروری ہے؟ کوئی ضروری کام ہے کیا؟'' دوسری طرف سے نخرے بھری آواز آئی۔

''زیادہ تنگ مت کرو۔کچھ فرائض کی ادائیگی کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔آجاؤں گی۔اگر اتنا اصرار کرتے ہو۔''

دوسری طرف سے فون بند ہوگیا۔ میں سیٹی بجاتے ہوئے کھڑا ہوگیا اور سامنے دیوار گیر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔

باس اور مرزا

آج پھر مرزا کو دفتر پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی۔ایک تو رات بھر بارش ہوتی رہی تھی، او پر سے اس بارش کی وجہ سے رش بھی بڑھ گیا تھا۔تمام بس اسٹاپ بھیڑ سے بھرے ہوئے تھے۔مطلوبہ بس کے انتظار میں مرزا کو کافی دیر کھڑے رہنا پڑا تھا۔جب بس آئی بھی تو مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔اس پر مرزا کو بس کی چھت پر بیٹھ کر سفر طے کرنا پڑا۔یہ سفر مرزا کی طبیعت پر بہت بھاری پڑا۔ایک تو مرزا جیسے نک سک شخص کو جو انتہائی نفیس سوٹ پہنتا تھا اجڈ گوالوں کے ساتھ چھت پر بیٹھنا پڑا اور پھر ان گوالوں کے جسموں سے پسینے اور گوبر کی ملی جلی ایسی ناگوار بو آتی تھی کہ مرزا کو اپنا رومال منہ پر رکھنا پڑا۔ ابھی مرزا نے دو روز پہلے ہی اپنا یہ سوٹ شہر کے بہترین درزی سے سلوایا تھا۔سوٹ تھا بھی بڑھیا کپڑے کا جو ان کے بہنوئی نے خاص انہی کے لیے لندن سے بھجوایا تھا۔اس سفر کے دوران یہ سوٹ بھی غارت ہوگیا۔شکنیں تو پڑیں ہی پھر کیچڑ کے چھینٹوں نے بھی اس کا ستیاناس کر دیا۔

رہی سہی کسر تو تب پوری ہوئی جب مرزا اپنے دفتر پہنچے۔دفتر میں ان کا بل ڈاگ کی شکل کا باس ان کے انتظار میں اپنے نتھنوں سے یوں دھواں نکال رہا تھا جیسے کوئی سیاہ کھڑ پنچ اسٹیم

''انجمن چلنے کو تیار ہو۔ مرزا کے اندر داخل ہوتے ہی وہ پھنکارا۔

''آ گئی انگریزی سرکار۔ عین وقت پر''۔

''بس وہ سر آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل بارش کی وجہ سے رش بہت تھا۔ اس لیے بس کی چھت پر بیٹھ کر آنا پڑا'' مرزا ممیائے۔

''واہ بھئی سلطنت انگلشیہ کے آخری گماشتے۔ کتنی بار کہا ہے کہ وقت پر آیا کر۔ ایک تیرے آباؤ اجداد تھے کہ لوگ ان کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کیا کرتے تھے''۔ باس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

چونکہ مرزا ہمیشہ پتلون بشرٹ یا سوٹ میں ملبوس رہتے تھے۔ اس لیے ان کا باس انہیں انگریزی فلم کا دیسی چربہ یا پھر کاٹھا انگریز کہا کرتا تھا۔

''وہ سر بات یہ ہے کہ۔۔۔'' مرزا نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تو باس نے بات بیچ ہی سے اچک لی۔

''وہ سر بات یہ ہے کے بچے۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ کبھی دیسی لباس بھی پہن لیا کر۔ لیکن تو ہے کہ گورے کی نمک حلالی سے باز ہی نہیں آتا۔ سوٹ خراب ہو گیا ہے لنگی پہننے والی سرکار کا''۔

مرزا کے چہرے پر مسکینی نے جالا بننا شروع کر دیا۔

''غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیں سر''۔ انہوں نے باقاعدہ معافی مانگ لی۔

اس کے بعد مرزا اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس دوران انہیں ہنسی کی دبی دبی گئی آوازیں سنائی دیں لیکن انہوں نے طوعاً و کرہاً ان کو نظر انداز کر دیا۔ پھر ایسا مرزا کے ساتھ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔

باس ایک پھٹے ہوئے بھینسے کی طرح خوب موٹا تازہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ چندیا پر چند بال لہلہاتے رہتے تھے جن کو وہ وقتاً فوقتاً اپنی جیبی کنگھی سے سنوارتا رہتا تھا۔ رنگ توے کی طرح کالا تھا۔ جب بھی وہ سوٹ میں پھنسا پھنسایا دفتر آتا تھا تو دفتر کی چند سیڑھیاں ہی چڑھ کر بری طرح ہانپ رہا ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے اور گردن پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہوتی تھیں جنہیں وہ تولیہ جیسے رومال سے پونچھتا جاتا تھا اور غراتا جاتا تھا۔

جب سے باس اس سیٹ پر آیا تھا مرزا ہی نہیں سب دفتر والے اس سے تنگ تھے۔اس کا ہتک آمیز رویہ بعض اوقات جارحانہ ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے سب اس سے ڈرتے بھی تھے۔

''ابے او مرزا۔ایک لیٹر درست کرنے کو دیا تھا۔ناس مار دیا سارے خط کا۔کہا تھا کہ صرف فگرز درست کر لینا۔لیکن تو نے تو پرانی فگرز بھی غلط کر دیں۔ابے او مرزا قلیچ بیگ کی چھٹی نسل کے تاجدار کہیں تو نے میٹرک بھی تو ریوڑیاں دے کر پاس نہیں کیا تھا۔'' ان کا باس ڈانٹتے ڈانٹتے ہنس پڑا۔

آج تو حد ہو گئی تھی ذلت کی۔مرزا نے اپنی میز سے سر اٹھایا تو باس دانت نکالے ہنس رہا تھا۔

مرزا اپنی نشست سے اٹھے اور اٹھ کر ایک زوردار گھونسہ باس کے منہ پر دے رسید کیا۔حملہ اچانک تھا۔باس حیرت کی شدت اور گھونسے کے زور سے اڑتا ہوا دس فٹ دور جا گرا۔مرزا وہاں اڑتے ہوئے پہنچے اور نیچے گرے ہوئے باس پر گھونسوں کی برسات کر دی۔اس کا چہرہ بری طرح مسخ ہو گیا تھا اور سامنے کے سارے دانت بھی لہو سے بھر گئے تھے۔سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور وہ مار کھاتے کھاتے بری طرح تڑپ رہا تھا۔مرزا نے اسی پر بس نہیں کی۔باس کے سینے پر لات رکھ کر اس کا بازو زوردار جھٹکے سے نیچے کی جانب موڑ دیا۔کڑک کی آواز آئی اور باس کا بازو بیچ کہیں سے ٹوٹ گیا۔اب وہ زمین پر گرا کسی زخمی جانور کی طرح چوں چوں کی آواز کے ساتھ کراہ رہا تھا۔

مرزا نے تشدد کرنے کے بعد اپنی میز کا رخ کیا اور پیشانی پر آئی بالوں کی لٹ کو بڑے انداز سے سنوارتے ہوئے کرسی پر آن بیٹھے۔ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ دفتر کے بقیہ سہمے ہوئے عملے کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ایک دم ان کو بھونچال سا محسوس ہوا۔

ان کو جیسے ہوش سا آ گیا۔

باس سامنے کھڑا غرا رہا تھا۔

''ایک تو غلطی کرتا ہے اوپر سے مسکراتا ہے۔یہ جو تیری ایک ڈیڑھ پسلی ہے اس کو بھی

توڑ دوں گا۔ چل چل، اب آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا''۔
مرزا نے سہمے ہوئے انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور میز پر پڑی فائلوں میں سے ایک پر جھک گئے۔
اس واقعے کو دو روز ہی گزرے تھے کہ باس کا اردلی گھبرایا ہوا مرزا کے پاس آیا اور انہیں پیغام دیا کہ صاحب بلا رہے ہیں۔ مرزا نے گھبرا کر پوچھا کہ باس کا موڈ تو اچھا ہے۔
''آج تک کبھی اچھا ہوا ہے''۔ اردلی نے جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس چلا گیا۔
جب مرزا نے باس کے کمرے میں قدم رکھا تو باس اچھے خاصے موڈ میں سامنے بیٹھا تھا۔ مرزا کو دیکھتے ہی بولا۔
''مرزا صاحب جی تو چاہتا ہے کہ دروازے پر آ کر آپ کا استقبال کروں مگر پھر سوچا کہ دفتری پروٹوکول بھی کوئی شے ہوتا ہے۔ آیئے آیئے تشریف رکھیے''۔
مرزا گھبرائے ہوئے انداز میں باس کے عین سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔
''کہیے تو آپ کے لیے چائے منگواؤں یا پھر کافی سے شوق کریں گے''۔ باس کے لہجے میں مہمان نوازی سے ہٹ کر بھی کچھ تھا۔
''نہیں نہیں سر، یہ تکلف مت کیجئے۔ ہاں اگر ہو سکے تو ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس منگا دیجیے''۔ مرزا بولے۔
باس نے گھنٹی بجائی اور اردلی کو ٹھنڈا پانی لانے کا کہہ کر برخاست کر دیا۔
گھڑی کی ٹک ٹک مرزا کے اعصاب پر دستک دے رہی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے اردلی پانی لایا تو باس نے اسے خاص ہدایت کی کہ جب تک وہ نہ کہے دفتر کے اندر کسی کو نہ آنے دیا جائے۔
دروازہ بند ہوتے ہی باس کرسی سے اٹھ کر میز کے کونے پر آ بیٹھا۔ مرزا کو اچھو آ گیا۔
''مرزا صاحب۔ آج مجھ تک ایک خبر پہنچی ہے۔ آپ نے کل ہی کسی سے فرمایا ہے کہ میرا ایک دو روز میں تبادلہ ہو جائے گا۔ اور اگر نہ ہوا تو بقول آپ کے میں خود اس گینڈے کا یا تو

تبادلہ کرادوں گا یا پھر اسے چڑیا گھر کو بطور تحفہ دے دوں گا"۔

مرزا کو جیسے کچھ یاد سا آ گیا۔ان کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

جب آدھ گھنٹے بعد مرزا صاحب باس کے کمرے سے باہر نکلے تو پسینے میں شرابور تھے۔ ان کی پتلون کھسک کے ایک جانب ہوگئی تھی آدھی شرٹ اس کے اندر تھی اور آدھی باہر۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں گویا کسی عمل تنویم کے زیرِ اثر چلتے ہوئے اپنی نشست پر آن بیٹھے۔

ایک ساتھی نے کھنکار کران کو اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ گویا نیند سے چونک کر اٹھ گئے اور ایک مصنوعی مسکراہٹ سے بولے۔

"ضروری میٹنگ تھی۔ باس نے صرف میری رائے کو اس قابل سمجھا"۔

پھر وہ خود ہی پُرسوچ انداز میں سر ہلانے لگے۔

اسی باس کے ہوتے ہوئے مرزا کی شادی آن ٹھہری۔ شادی کے لیے چھٹی کی درخواست پر دستخط کرتے ہوئے باس نے شرارتاً آنکھ مارتے ہوئے مرزا کو کہا "مرزا شادی کر رہے ہو۔ پہلی ہی ہے نا"۔

"جی ہاں" مرزا منمنائے۔

"کہیں پہلے تو کوئی اور کہیں چھپا تو نہیں رکھی"۔

"جی نہیں"۔

"کبھی کوئی عورت شورت رکھی شکھی تو نہیں ہے"۔

"جی نہیں"۔

"کوئی کالج کا جوانی کا تجربہ"۔

"جی نہیں"۔

"اس کا مطلب ہے کہ قطعی طور پر نا تجربہ کار ہو"۔

"جی۔۔۔۔جی ہاں"۔

"اگر شادی کی پہلی رات کو مشکل وشکل ہو کوئی مسئلہ ہو تو میری خدمات حاضر ہیں"۔

باس قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

مرزا کے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ رواں رواں بھڑک اٹھا۔

مرزا ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر خرانٹ عورت کو دھکیلے لیے جا رہے ہیں۔ وہ عورت چیختی چلاتی جا رہی ہے۔ لیکن مرزا پر ہوس سے زیادہ غیظ وغضب کا بھوت سوار ہے۔ بالآخر وہ اس کو ایک خالی کمرے میں لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بڑی مشکل سے دروازے کی اندرونی چٹخنی چڑھاتے ہیں۔ پھر کانپتے ہاتھوں سے بے لباس ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ آخر کار وہ صرف ایک جانگئے اور بنیان میں رہ جاتے ہیں۔ ان کی ٹانگیں لرز رہی ہیں۔ عورت کسمسا کر مسہری سے اٹھتی ہے۔ مرزا کے ایک زوردار تھپڑ رسید کرتی ہے۔ مرزا کو دن میں تارے نظر آجاتے ہیں اور وہ عورت کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔

وہ عورت باس کی بیوی ہے۔

جلد ہی مرزا کے تخیل کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

باس کہہ رہا تھا۔

''ارے دیکھو۔ شادی کے خیال سے ہی تمہارے چہرے پر پسینے آگئے ہیں۔ کمرے میں کیا خاک کارروائی کرو گے''۔

''جی نہیں۔ جی ہاں۔'' مرزا دھیمے دفاعی لہجے میں بولے۔

جب مرزا شادی کی چھٹی سے آئے تو گل وگلنار ہو رہے تھے۔ خود ہی خود میں شرما رہے تھے۔ دفتر کے تمام ارکان نے ان کو بہت گرمجوشی سے مبارکباد دی۔ مرزا صاحب شرمائے شرمائے لہجے میں مبارکبادیں وصول کر رہے تھے اور ساتھیوں کو نہ بلانے کی وضاحتیں کر رہے تھے کہ باس کا بلاوا آن پہنچا۔

مرزا باس کے کمرے میں داخل ہوئے تو باس نے بہت گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

''بہت بہت مبارک ہو مرزا۔ تم تو چھپے رستم نکلے۔ ہمیں شادی پر بلایا ہی نہیں۔''

''وہ جی سر بس صرف خاندانی فنکشن تھا''۔

''سب ٹھیک ہو گیا''۔ باس نے ذو معنی انداز میں پوچھا۔

''جی۔۔۔ جی سر'' وہ شرمائے۔

''ارے تم تو کچی عمر کی لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔ کیا واقعی سب کچھ ٹھیک رہا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا''۔

''نہیں سر''۔

''اچھا آ آ'' باس نے سر ہلایا جیسے کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا ہو۔

''ہاں سر۔ میرا مطلب ہے کہ شرما تو نہیں رہا۔ باقی سب ٹھیک رہا''۔ مرزا نے وضاحت کی۔

''مرزا یار بڑے بے مروت نکلے۔ میں نے تو شروع ہی میں پیشکش کر دی تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا۔ مگر میں روزانہ انتظار کرتا تھا کہ لو اب مرزا کا فون آئے گا کہ اب آئے گا۔ رات کو بھی کمرے میں فون رکھ کر سوتا تھا مبادا کہ کسی بھی لمحے میری ضرورت پڑ جائے مگر تم تو بہت ہی بے مروت نکلے مرزا''۔ باس نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔

مرزا اچھل کر باس کے کندھوں پر سوار ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے باس ایک سدھائے ہوئے بھالو کی طرح مرزا کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ مرزا ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو دعوت تماشا دے رہے ہیں اور باس اس ڈگڈگی پر ناچ رہا ہے۔ کبھی ایک پیر پر ناچتا ہے تو کبھی دوسرے پیر پر۔ اور پھر کبھی دونوں پیروں پر دھمال ڈال رہا ہے۔ کبھی بکری بن کر دکھا رہا ہے تو کبھی کچھوا بن کر۔ غرضیکہ ایک تماشا جاری ہے۔

اچانک خیالات کا طلسم ٹوٹ گیا۔

''چلو مرزا اب جا کے کام سنبھالو۔ تمہارے نہ ہونے سے کتنا سکون تھا۔ سارے کام کس طریقے سے ہو رہے تھے۔ اب آ گئے ہو تو نہ جانے کون سا گل کھلاؤ گے۔ چلو شاباش جاؤ اور کام سنبھالو''۔ باس تحکمانہ انداز میں بولا۔

''جی سر''۔ مرزا نے سر جھکا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ ساتھ ہی کمرے میں ایک دبی دبی گالی کی بدبو چھوڑ گئے۔

ایک روز جب مرزا ابھی میز پر جھکے کچھ کام کرنے میں منہمک تھے کہ ان کو اپنے ارد گرد کی میزوں پر کھسر پھسر سنائی دی۔ انہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ بلکہ دل ہی دل میں سوچا کہ

ضرور پھر سے کوئی دفتری سازش ہوگی جس میں سب لوگ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ باس کا اردلی بھاگا بھاگا ان کے پاس آیا۔

''سر جی کچھ معلوم ہے آپ کو''۔

''کس بارے میں؟''

''اجی صاحب ایک ہی موضوع پر تو پچھلے ایک گھنٹے سے دفتر میں بحث ہو رہی ہے''۔

''کون سا موضوع؟''

''بڑے صاحب کے تبادلے کا''۔

''ارے نہیں بھئی نہیں۔ اب میں اس موضوع پر کچھ نہیں بولنے والا۔ پہلے ہی ایک مرتبہ بول کر اپنی عزت خراب کرا چکا ہوں''۔ مرزا صاحب کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''نہیں صاحب آپ غلط سمجھے ہیں۔ آج صبح سویرے ہی دفتر میں فیکس آ گیا تھا بڑے صاحب کے تبادلے کا۔ ان کا تبادلہ ہو گیا ہے''۔

''کیا واقعی؟'' مرزا کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''تو کیا میں جھوٹ بولتا ہوں۔ میں نے خود دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے۔ آپ تو سدا کے سادے ہیں۔ سارے دفتر کو خبر ہے اور آپ کو تو جیسے کچھ پتہ ہی نہیں''۔

مرزا اردلی کو بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے بات جاری رکھی ''صاحب آج صبح ہی سے کچھ چپ چپ سے ہیں۔ ڈاک بھی نہیں دیکھی۔ اور تو اور چائے کا ایک کپ تک نہیں مانگا مجھ سے۔ بس فون پر فون ملائے جا رہے ہیں''۔

مرزا نے ایک گہرا آسودہ سانس لیا۔

باس کے رخصت ہونے پر اس کے اعزاز میں ایک شاندار کھانے کا انتظام کیا گیا۔

کھانے کے بعد دفتر کے سب لوگوں کو اپنے اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دی گئی۔ ہر کسی نے اپنی بساط کے مطابق خیالات کا اظہار کیا۔ کسی نے بیچ میں اشعار کا سہارا لیا تو کسی نے بہت شاندار اور ثقیل زبان میں باس کی خدمات کے اعتراف میں اسے خراج تحسین پیش کیا۔ سب کی تقاریر میں ایک بات مشترک تھی اور وہ تھی باس کی عظمت، بندہ پروری، دریا دلی اور مشفق

روپے کی توصیف۔ باس یہ سب باتیں سن کر گویا کھل اٹھا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا تھا۔

مرزا یہ سب بہت انہماک سے دیکھ رہے تھے اور اس ماحول سے محظوظ ہو رہے تھے۔
آج وہ اپنے اندر وہی تازگی اور شوخی محسوس کر رہے تھے جو شاید انہوں نے کبھی جوانی میں محسوس کی تھی۔

اچانک مرزا کا نام پکارا گیا۔

وہ گویا خواب سے چونک اٹھے۔

جب دوبارہ ان کا نام لیا گیا تو وہ نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

سب لوگ ایک پراشتیاق تجسس سے ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔

مرزا نے خواب کی سی حالت میں ایک اچٹتی سی نظر سب چہروں پر ڈالی۔ چند چہروں پر ان کو طنزیہ مسکراہٹ نظر آئی۔ چند ہونٹوں سے ہنسی کی دبی دبی آوازیں نکل کر ہال میں پھیل گئیں۔

باس کے دمکتے چہرے پر ہلکی سی سنجیدگی کے سائے لہرائے۔

مرزا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور خطاب شروع کیا۔ شروع میں ان کے گلے سے سیٹی کی سی آواز نکلی۔

انہوں نے پھر کوشش کی تو حلق سے توصیف آمیز گھٹے گھٹے سے الفاظ برآمد ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی ہال کی فضا بے اختیار ہنسی کی پھوار میں بھیگ گئی۔

مرزا کی آنکھیں وفورِ جذبات سے بھر آئیں اور گلے میں ایک گولا سا پھنس جانے کی وجہ سے آواز بھرا گئی۔

باس بغور مرزا کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر پہلی مرتبہ مرزا کے لیے شفقت آمیز ہمدردی پھیل گئی۔

مرزا نے پھر بولنے کی کوشش کی تو ان کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے اور آنکھوں سے نمی باقاعدہ چھلکنے لگی۔

باس وفورِ جذبات سے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھا اور ساتھ میں کھڑے مرزا کی پیٹھ تھپکی اور ان کے کندھوں کے گرد باز و حمائل کرتے ہوئے بولا

''مرزا مجھے تمہارے جذبات کی بہت قدر ہے۔ بہت بہت شکریہ''۔

ادھر مرزا اب باقاعدہ ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔

افسرِ اعلیٰ

شاہانی صاحب وفورِ جذبات میں بولتے چلے گئے۔ ''صفیہ۔ دیکھو ابھی مجھے آئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا' سامان سے پیکنگ بھی نہیں کھلی اور میرا اسٹاف ابھی سے ہی مجھے کہتا ہے' سر آپ جیسا افسر ہم نے پہلے نہیں دیکھا اور صرف میرا اسٹاف ہی نہیں کہتا بلکہ شہر سے جو بھی ملنے آتا ہے اسی طرح سے تعریف میں لتھڑا ہوتا ہے۔''

صفیہ بیگم شاہانی صاحب کی نکٹائی کی گرہ کھولتے کھولتے ہنس پڑیں۔ ''جانے بھی دیں۔ یہ سب چاپلوسیاں چڑھتے سورج کو سلام ہیں۔ اس سے پہلے جب آپ کھڈے لائن لگے ہوئے تھے تو کتنے لوگ آپ کو ملنے آتے تھے؟''

شاہانی صاحب جھنجھلا سے گئے۔ ''تم سب بیویاں ایک سی ہوتی ہو۔ شوہر کی کوئی تعریف تو برداشت ہی نہیں ہوتی۔ جذبی میاں نے تو اس روز کیا خوب کہا کہ حضور جان کی امان پاؤں تو ایک گستاخی سرزد کرنے کی اجازت چاہوں گا۔'' شاہانی صاحب نے آواز بدلتے ہوئے اپنے سیکریٹری کے انداز کی نقل اتاری۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''اس پر میں شرمندہ ہو گیا۔ ایک تو جذبی میاں اتنے وفادار اور تابعدار ہیں کہ انسان اپنے آپ کو خود ہی میں بہت بڑا بڑا

محسوس کرنے لگتا ہے۔''

''کیا بکا جذبی نے؟''صفیہ بیگم پھنکاریں۔

''بے چارے نے کہنا کیا تھا۔بس اتنا کہا ''عالیجاہ میرا تمام عمر کا تجربہ ایک بات کی گواہی دیتا ہے اور وہ یہ کہ تمام بیویاں اپنے شوہروں کو کہتی ہیں کہ یہ میں ہی تھی جو اب تک آپ کے ساتھ گزارا کر گئی۔کسی اور عورت میں نہ تو اتنی ہمت ہے اور نہ ہی اتنی برداشت کہ آپ کے ساتھ گزارا کرتی۔پھر بات کر کے شوہر کے سر پر آن بیٹھتی ہیں۔''شاہانی صاحب ہنس پڑے۔

صفیہ بیگم تیوری چڑھاتے ہوئے بولیں۔''جذبی نے یہ تو بکنا ہی تھا۔بے چارے کی پہلی بیوی ایک نمبردار کے ساتھ جو بھاگ گئی تھی۔دوسری نے ویسے ہی خلع لے لیا اور تیسری دو سال سے ایسی اپنے میکے گئی ہے کہ آج تک واپس نہیں لوٹی۔''

شاہانی صاحب لباس بدلتے بدلتے رک گئے۔''تمہیں ان سب تفصیلات کا کیسے پتہ ہے؟''

''مجھے اس مردود کے اور بھی کارنامے پتہ ہیں۔بھنگن نے تو نہ صرف جذبی کے کارنامے سنائے ہیں بلکہ اُس میسنے مالی نے جو شکل سے اتنا مسکین لگتا ہے اور ہر وقت سر جھکا کر باڑھ کو تراشنے میں لگا رہتا ہے کے کرتوتوں کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ہائے اللہ یہ مرد اندر سے کتنے پکے ہوتے ہیں۔''صفیہ بیگم بناوٹی غصے سے بولیں۔پھر میاں کے تیور بدلتے دیکھ کر کہنے لگیں۔''سوائے آپ کے۔''

شاہانی صاحب اس پر مصنوعی خفگی سے بولے۔''اب بناؤ مت اور جا کر کھانا لگواؤ۔ آج کا سارا دن تو اپنی تعریفیں سننے میں کٹ گیا۔''

باہر بھنگن اور مالی کانا پھوسی میں مصروف تھے

''بشیراں۔صاحب کا اتنا سامان آیا ہے،اتنا آیا ہے کہ لگتا ہے انہوں نے اس سے پچھلی بدلیوں میں اچھا مال پانی بنایا ہے۔''یک چشم مالی گویا دانائی کی کوئی بات کہتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔

''نہیں نئیں۔ بیگم صاحب نے مجھے خود بتایا ہے کہ پیچھے صاحب کے مربعے ہیں۔ ایک تو ٹوٹٹ ہر بات میں کوئی نہ کوئی غلط چیز نکال لیتا ہے۔'' بشیراں نے صفائی پیش کی۔

''تو کتنی بھولی ہے بشیراں۔ یہ مربے شربے سب جھوٹ باتیں ہوتی ہیں۔ بھلا رب کو سب مربعے صاحب لوگوں کو ہی دینے تھے اور ہمیں کھوکھوتی ملنا تھی۔''

''او جیرے، یہ کھوتی سے تیرا مطبل کیا ہے۔'' بشیراں غصے سے بولی۔

''ایک تو تو ہر بات اپنی طرف لے جاتی ہے۔ تم ان پڑھ لوگوں میں عقل مَت اتنی کم ہوتی ہے۔ اور پھر تُو میری ہوئی ہی کب ہے۔'' دو جماعت پاس جیرا بشیراں کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

بشیراں شرما گئی۔ ''اب کے میرے اوپر لائن ماری نا، تو تیرے بابے کو بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر بشیراں پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔

جیرا واہیات انداز میں زیرِلب مسکراتا رہا۔

اتنے میں اندر کوٹھی میں کھانا لگ چکا تھا۔ شاہانی صاحب تازہ دم ہو کر میز پر آ بیٹھے تھے اور صفیہ بیگم سے محوِ گفتگو تھے۔ ''صفیہ۔ ضلع پہلی مرتبہ ملا ہے۔ اس سے پہلے ساری زندگی بس دفتروں میں ہی گزار دی۔ انسان کے لیے تو یہ افسری بھی ایک امتحان ہے۔ اگر سر کو چڑھ جائے تو نشے کی لت ہے اور اگر نہ چڑھے۔۔۔۔ پر کیسے نہ چڑھے۔ جب سب شہر افسر کے اشاروں کا منتظر ہوتا ہے، ہر دوسرا صاحب حیثیت آدمی آپ کو اپنے گھر کھانے پر بلانے میں عزت محسوس کرتا ہے، تمام سرکاری محکموں کے سربراہ ضلع افسر کے پاس آتے ہیں تو اپنی اہمیت کا احساس نہ چاہتے ہوئے بھی ہو ہی جاتا ہے۔''

''مگر وہ پہلے والی بات تو نہیں۔'' صفیہ بیگم نے اعتراض کیا۔

''ہاں وہ پہلے والی بات تو نہیں جب تمام اختیارات افسرِ اعلیٰ کے پاس ہوتے تھے۔ بلکہ پولیس والے بھی اُسی کو جوابدہ تھے۔ وہ والے کروفر تو نہ سہی مگر پھر بھی دوسری نوکریوں سے بہت بہتر ہے۔'' شاہانی صاحب نے توجیہہ پیش کی۔

اس پر صفیہ بیگم بولیں۔ "مگر یہ جو سیاستدان ہیں، مجھے تو زہر لگتے ہیں یہ۔"

"دیکھو صفیہ۔ نشیب و فراز تو نوکری کا حصہ ہیں۔ یہ لوگ کون سے مستقل ہیں، یہ آج ہیں کل نہ ہوں گے، پھر حکومتیں تو بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی پالیسیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ آخر سرکار کا حکم سرکاری افسر کے سہارے کے بغیر اس پسماندہ معاشرے میں کیسے کارگر ہو سکتا ہے۔" شاہانی صاحب بات کی گہرائی میں گم ہو گئے۔

"چیف صاحب کی بیوی اس روز شام کی چائے پر کہہ تو رہی تھیں کہ پرانے نظام کو اس حد تک بگاڑ دیا گیا ہے کہ یہ ناقابلِ اصلاح ہو گیا ہے۔ اس کی مستقبل میں جتنی بھی پلاسٹک سرجری کر لی جائے یہ واپس اپنی تازگی دوبارہ حاصل نہیں کر سکتا۔" صفیہ بیگم افسردگی سے بولیں۔

"کہتی تو وہ سچ ہیں مگر جو ہاتھ میں ہے کم از کم اس کی تو قدر کرنا چاہیے۔ بے وجہ کی پریشانیاں تو ویسے بھی صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔" شاہانی صاحب نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

جذبی میاں کہنے کو تو شاہانی صاحب کے سیکریٹری تھے مگر تھے گرگِ باراں دیدہ۔ اگر اکبر کے دور میں پیدا ہوتے تو یقیناً نورتنوں میں جگہ پاتے۔ اپنے افسر کے سامنے تو وہ بچھ بچھ جاتے۔ اتنے فرشی سلام کرتے کہ بعض اوقات ان کی حرکات و سکنات مضحکہ خیز ہو جاتیں۔ شاعری کا شوق رکھتے تھے اور بے وزن اشعار بھی کہتے تھے۔ مگر ثقیل تراکیب و الفاظ کا زیادہ تر استعمال افسرانِ بالا کو رجھانے میں ہوتا تھا۔ "حضور کی شان کے کیا کہنے۔" وہ دہرے ہوئے جاتے۔ "حاکمِ ضلع کے حکم سے انکار کس کافر کو ہے۔ آپ جناب تو ٹھہرے ضلع کے مالک۔" وہ کورنش بجا لاتے۔

یہ ضلع کے مالک کی ترکیب کا استعمال اس کثرت سے ہوتا کہ شاہانی صاحب کبھی کبھار اپنے آپ کو واقعی ضلع کا مالک سمجھ بیٹھتے اور خلقت کو رعایا۔ اس تمام تخیلاتی نظام میں جذبی میاں بھی ایک خلعت پہنے منصب دار نظر آتے۔

مگر چونکہ شاہانی صاحب طبعاً عاجز واقع ہوئے تھے اس لیے بہت جلد تکبر کے احساس سے چھٹکارا پا لیتے۔ بس کبھی کبھار صفیہ بیگم کو چھیڑ دیتے "ارے بھئی ہم تو ٹھہرے ضلع کے مالک، تو کیوں نہ اپنی رعایا میں سے کوئی حسین نازنین حرم میں داخل کر لیں۔ تمہاری خوب خدمت کرے گی۔" پھر دیر تک ہنستے رہتے۔

ایسے میں صفیہ بیگم جل بھن کر کباب ہو جاتیں۔

شاہانی صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو قابلِ ستائش تھا۔ وہ واقعی دل سے ضلع کی ترقی کے خواہاں تھے۔ گرانٹ تو مقرر کر دی گئی تھی۔ ترقیاتی منصوبے ایک حد سے بڑھ کر نہیں ہو سکتے تھے' مگر انتظامی امور میں اصلاح کی بہت گنجائش تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے کام عدم توجہی کے باعث تعطل میں پڑے تھے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں متنازعہ امور کے باعث پایہء تکمیل کو نہ پہنچ پائی تھیں۔ شاہانی صاحب نے رات گئے تک میٹنگیں بلانی شروع کر دیں۔ اداروں کے باہمی تعاون کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کام کا آغاز کیا۔ مختلف گروہوں میں رنجشیں ختم کرا کے زیرالتوا امور کو نمٹانا شروع کیا۔ ٹھیکیداروں کے مسائل کی جانب توجہ کی تاکہ ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد زیادہ تندہی سے ہو سکے۔ ان اقدامات سے جہاں ان کی وقعت میں اضافہ ہوا وہیں جذبی میاں دوہرے ہو ہو کر گویا کمر درد کے مستقل مریض بن گئے۔

اسی دوران شاہانی صاحب کو ایک ذاتی صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی والدہ فوت ہو گئیں۔ بچے دادی کے پاس ہی صوبائی دارالحکومت میں بغرض تعلیم مقیم تھے۔ ان دنوں وہ بیٹے کے پاس آئی ہوئی تھیں کہ دورہ دل برداشت نہ کر پائیں۔ والدہ کی وفات پر پورا شہر تعزیت کے لیے امڈ آیا۔ چھوٹا شہر تھا۔ خبر بھی جلد پھیل گئی تھی۔ جذبی میاں کا رو رو کر برا حال تھا۔ ہچکیاں لے لے کر ان کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

جنازے میں سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ شدتِ غم سے نڈھال شاہانی صاحب کے دل میں ایک چور سا شگوفہ مسرت بھی کھل اٹھا تھا۔ کتنے لوگ ان کے غم میں شریک ہونے اتنی دور سے صوبائی دارالحکومت آئے تھے۔

دفناتے وقت جذبی میاں خود قبر میں اترے۔ قبر میں لیٹ کر اس کی لمبائی چوڑائی کا حساب لگایا۔ پھر روتے ہوئے اس احتیاط سے جسدِ خاکی کو قبر میں اتارا کہ شاہانی صاحب کے دل میں ان کا مقام کئی درجے بڑھ گیا۔ 'وقت سب سے بڑا مرہم ہے' بہت سے زخموں کو بھر دیتا ہے اور پھر دنیا کے لیے جینا بھی تو پڑتا ہے۔' یہ سوچ کر شاہانی صاحب بجھے دل کے ساتھ ضلع میں لوٹ آئے اور روزانہ مصروفیات میں اپنے آپ کو مگن کر لیا۔

لمحے دنوں میں اور دن ہفتوں میں بدلنے لگے۔ ضلع کا کام معمول کے مطابق چلتا رہا۔ شاہانی صاحب نے ضلعی عملے کے لیے چند منصوبوں پر عملی کام شروع کرایا۔ ان میں سرفہرست ان کی رہائشی کالونی کا منصوبہ تھا جو مدتوں سے کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ منصوبے کے اجراء کی دیر تھی کہ شاہانی صاحب کو گویا پھولوں میں تول دیا گیا۔ عملے کا ہر رکن ان کے گن گانے لگا۔ ان تک ستائش کی خبریں نمک مرچ لگا کر پیش کی جاتیں۔ خوشی سے ان کا دل پھول کر کپا ہو جاتا۔ ''دیکھو بیگم۔ میں ایک تاریخ رقم کر رہا ہوں۔ ہاؤسنگ پروگرام کی افتتاحی تختی پر میرا نام لکھا گیا ہے اور رسم آغاز بھی مجھ سے کروائی گئی ہے۔ چلو کل کو کہیں اور تبادلہ ہو جاتا ہے تو بھی ایک نشانی تو رہے گی۔ اور پھر نشانی سنگ مرمر کا پتھر نہیں بلکہ وہ ہے جو عملے کے ہر فرد بلکہ ضلع بھر کے لوگوں کے دلوں پر نقش ہے۔'' شاہانی صاحب اپنی عظمت کے احساس سے معمور جذبے میں سرگوشی کرتے۔

وہ سمجھاتیں۔ ''میں آپ کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن ایسی کتنی ہی تختیاں پہلے بھی لگیں اور ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ آپ نے کوئی انوکھا کام تو نہیں کیا۔ سرکاری ملازم ہیں' ذمے داری دی گئی تھی' احسن طریقے سے کر رہے ہیں۔ اور بس۔''

وہ جل جاتے۔ ''ایک تو تم سے میری تعریف برداشت نہیں ہوتی۔ ارے بھئی یہ خوشامد نہیں ہے۔ ایک شخص نہیں کہتا' دو تین کی بات بھی نہیں' ہر زبان کہتی ہے۔ اب سب مل کر جھوٹ بولنے سے تو رہے۔ اور تم اپنی یہ مایوسی کی باتیں دل ہی میں رکھا کرو۔''

ایک مرتبہ وہ بہت مسرور تھے۔ رات کو مطالعے کے بعد لیمپ کی روشنی گل کرتے ہوئے بیگم سے کہنے لگے۔ ''آج ایم این اے آیا تھا۔ بہت مضبوط آدمی ہے۔ ہر کابینہ میں اس کے گروپ کا کوئی ایک وزیر ضرور ہوتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ کسی طرح اپنا ڈومیسائل اور ووٹ یہیں کا بنوا لوں۔ کل کو الیکشن لڑنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ آخر کو علاقے کے لوگ مجھے اس طرح یہاں سے جانے تو نہیں دیں گے۔ پھر سرکاری نوکری بھی کوئی نوکری ہے۔ وہی ٹگی بندھی زندگی۔ میں تو سوچتا ہوں کہ وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے کر یہیں سے الیکشن لڑلوں۔ آخر مقبولیت اور عوامی پسندیدگی کو درست وقت پر کیش کرانا ہی تو اچھے سیاستدان کی خوبی ہوتی ہے۔''

صفیہ بیگم کے مدھم خراٹوں کی آواز میں ان کی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔

وہ ایک گرم رات تھی۔ پشاور خان، جسے اس کے یار دوست ذومعنی انداز میں دِل پشوری خان بھی کہتے تھے نے ٹرک کو ڈرائیور ہوٹل پر کھڑا کیا اور تھکاوٹ دور کرنے کے ارادے سے اس سے اتر آیا۔ وہ صبح سے پہاڑی علاقے سے پتھر لے کر چلا تھا۔ پتھر بھاری تھا' اس لیے ٹرک پر بوجھ بھی زیادہ تھا۔ رستے کی سڑک بھی ہموار نہ تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ سڑک پر موڑ بھی بہت تھے۔ وہ ٹرک کو چیونٹی کی رفتار سے چلاتا لایا تھا۔ اس اعصاب شکن سفر سے اس کا دماغ چنج گیا تھا۔ اب اسے آرام کی ضرورت تھی اور آرام کا انتظام اس دلبر ہزارہ ہوٹل سے زیادہ بہتر کہیں اور نہ تھا۔

چائے کا گرم گرم کڑک دار کپ پینے کے بعد پشاور خان نے اپنے جانے پہچانے لڑکے کو اشارہ کیا۔ لڑکا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو آرام کا مکمل ''انتظام'' اس کی جیب میں تھا۔ انتظام کو جلا اور ریزہ ریزہ کر کے تمباکو کے ساتھ پشاور خان نے خالی کی ہوئی سگریٹ میں بھر لیا۔ ایک گہرا کش لے کر اس نے نعرہ ءکوچ بلند کیا اور چھلانگ لگا کر ٹرک پر سوار ہو گیا۔

ایک گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ٹرک سٹارٹ ہوا اور رینگنے لگا۔

شاہانی صاحب کی صبح ضروری میٹنگ تھی اور انہیں ہر حال میں ضلع واپس پہنچنا تھا۔ لیکن گاڑی کا ٹائر بھی رات کے اسی لمحے پنکچر ہونا تھا۔ ڈرائیور ٹائر بدل رہا تھا اور وہ بے چینی میں سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گاڑی سے کافی دور نکل گئے۔ انہیں کسی ان دیکھے خطرے کا سا احساس ہوا تو وہ تیزی سے واپس مڑے، پھسلے اور ہلکی گڑگڑاہٹ سے ڈھلوان پر پھسلتا ٹرک ان کے اوپر سے گزر گیا۔ ٹرک کے اندر گانے لگے ہوئے تھے۔ ڈرائیور لہر میں تھا۔ یکدم اس نے گھبرا کر ساتھ میں دیکھا۔ کلینر گہری نیند میں تھا۔ ڈرائیور نے خوف کے زیر احساس ایکسیلیٹر پر دباؤ اور بھی بڑھا دیا۔

جب تک شاہانی صاحب کی لاش علاقائی ہسپتال پہنچی تب تک سب ڈاکٹر چھٹی کر چکے تھے۔ ویسے بھی جب وہاں زندوں کو پوچھنے والا کوئی نہ تھا تو لاش کا کوئی کیا کرتا۔

اگلی صبح ضلع بھر میں یہ اطلاع بہت دکھ سے سنی گئی۔ اخبار میں ایک بکس میں یہ خبر شائع کی گئی۔ صفیہ بیگم کو بھی پچھاڑیں کھاتے کھاتے صبر آ ہی گیا۔ قریبی احباب سے مشورے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ انہیں ایک روز کے وقفے سے صوبائی دارالحکومت میں والدہ کے پہلو میں دفنایا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت کو یقینی بنایا جائے۔ اسی دوران نہ صرف نئے ضلعی افسر کی تعیناتی کا نوٹیفکیشن ہو گیا بلکہ اس نے فوری جوائن کرنے کا عندیہ بھی عملے کو دے دیا۔

اُدھر جب مٹھی بھر افراد میت کو لے کر جنازہ گاہ پہنچے تو وہاں درجن دو درجن افراد منتظر تھے۔ تھوڑی دیر انتظار کیا گیا۔ پھر صفیں باندھ لی گئیں۔

اور اِدھر جذبی میں عملے کو ہدایات دے رہے تھے۔ "دیکھنا بھائی۔ وہ تختی تو فوراً اتروا دو۔ ابھی تو بنیادوں کی کھدائی بھی شروع نہیں ہوئی۔ پھر سنا ہے کہ نئے صاحب طبیعت کے بہت تیز ہیں۔ کہیں برا نہ مان جائیں۔ مرحوم بہت خوبیوں کے مالک تھے مگر تھے بہت خوشامد پسند۔ اور ہاں دفتر کے باہر وہ استقبالی بینر لگوانا نہ بھولنا۔"

اور عمائدین شہر نئے افسر کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

اپنا گھر

قصہ کچھ یوں ہے کہ جب خاموش صاحب کے والد صاحب قبلہ بسترِ علالت پر آخری سانسیں لے رہے تھے تو انہوں نے بیٹے کو بلا کر دو نصیحتیں کیں' اول یہ کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ سر چھپانے کے لیے ایک مکان ضرور تعمیر کر لیں اور دوئم یہ کہ وہ ایک عدد ذاتی سواری ضرور رکھیں۔

پہلی نصیحت کے پسِ پردہ ایک دلخراش حقیقت یہ پوشیدہ تھی کہ والدِ محترم کی ساری زندگی گھروں کے کرائے چکاتے گزری تھی۔ ایک تو ان کی آمدنی محدود تھی' دوسرے مہینہ گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ اِدھر تنخواہ ملتی تھی اُدھر مالک مکان کے تقاضے شروع ہو جاتے تھے اور پھر ہر سال کرائے اتنے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ بسا اوقات انتہائی اہم ضروریات زندگی کو نظر انداز کر کے کرایہ چکانا پڑتا تھا۔ اب وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے فرزند بھی ساری زندگی اسی مشکل میں کاٹیں۔

دوسری نصیحت کے پس منظر میں بھی کچھ ایسے ہی عوامل کارفرما تھے۔ یہ نصیحتیں کرنے کے بعد قبلہ والد تو اس دنیا سے پردہ کر گئے مگر خاموش صاحب کی آنکھیں کھول گئے۔ اب خاموش صاحب نے ان دو مقاصد کے حصول کو زندگی کا نصب العین بنا لیا۔

دوسری نصیحت تو تبھی پوری ہو گئی جب انہوں نے اپنے دفتر کے ایک ساتھی کا استعمال شدہ سکوٹر بھلے داموں میں اس سے خرید لیا۔ لیکن پہلی نصیحت پر عمل بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ ایک تو رہائشی زمین کی قیمت بڑھتے بڑھتے آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی۔ دوسرے یہ کہ تعمیرات کے اخراجات بھی ان کی بساط سے کہیں بڑھ کر تھے۔ لیکن وہ پھر بھی ہمت نہ ہارے اور پائی پائی اکٹھی کر کے اسے معقول رقم میں تبدیل کرنے میں مصروف رہے۔

اسی دوران ان کی والدہ کا بھی دمِ آخر قریب آ پہنچا۔ ایک تو ضعیفی دوسرے آئے دن کی بیماریوں نے انہیں ہلکان کر دیا تھا۔ پچھلے چند برس سے وہ خاموش صاحب سے اصرار جاری رکھے تھیں کہ وہ اپنی زندگی میں بیٹے کو سہرے میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ابتدا میں تو انہوں نے بہت پس و پیش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے اپنے مکان کی تعمیر کی حسرت کو پورا کر لیں پھر شادی کا بھی سوچ لیں گے۔ پر جب ماں نے واسطے ڈالے اور اپنی موت کی منظر کشی کی تو ان کا دل پسیج گیا اور بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ادھر انہوں نے ہتھیار ڈالے ادھر لڑکی کی تلاش شروع ہو گئی۔ ہر ماں کی طرح ان کی والدہ بھی خوبصورت، خوب سیرت بہو چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی کم عمر کی الہڑ بانکی دوشیزہ ان کے گھر میں رونق لگائے مگر خود خاموش صاحب سنجیدہ عمر کی سمجھدار لڑکی چاہتے تھے کہ آخر کو وہ اپنی عمر کی اڑتیسویں بہار دیکھ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے ان کی والدہ کو ایک بائیس تیئس برس کی لڑکی پسند آ گئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

شادی کی رات خاموش صاحب نے اپنی بیوی کو اپنی بھرپور محبت کا یقین دلایا اور باور کرا دیا کہ ان کی زندگی میں وہی ان کی پہلی اور آخری محبت ہے۔ اس بے لوث محبت کے اظہار پر بیوی نے سر جھکا دیا۔ ہاں خاموش صاحب نے دلہن کو ذاتی مکان کی اپنی شدید خواہش کا بھی بتایا اور اس سے تعاون بھی مانگا۔ دلہن نے دھیمے سروں میں ان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا تو خاموش

صاحب نے بے اختیار ہو کر اس کے کول مہندی لگے گورے ہاتھوں کو گرمجوشی سے تھام لیا۔ پھر یہ فیصلہ بھی ہوا کہ جب تک اپنا ذاتی مکان نہ بنا لیا جائے خاندان کو بڑھایا نہ جائے۔

شادی کے ابتدائی چند دن تو سرشاری میں گزرے۔ پھر سب زندگی کی مصروفیات میں مگن ہو گئے۔ خاموش صاحب کی جمع پونجی تو بیاہ کی رسومات کی نذر ہو گئی تھی لہٰذا پیسوں کو جمع کرنے کی مہم کو ازسرنو ترتیب دینا پڑا۔

جس دفتر میں خاموش صاحب ملازم تھے وہاں کی آمدنی میں سے قابل ذکر رقم پس انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ قرض لینے کو ان کا جی ویسے بھی آمادہ نہ تھا۔ سو کسی اور نوکری کی تلاش شروع ہوئی۔ ان کے دفتر کے ایک ساتھی نے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ اسے کسی اچھے معاون کی ضرورت تھی۔ وہ خاموش صاحب کی محنت اور دیانت سے شناسا تھا، سو انہیں معقول مشاہرے پر کام کرنے کی دعوت دے دی۔ اندھے کو نظر کے سوا اور کیا چاہیے سو انہوں نے فوراً ہاں کر دی۔

اتنی پرانی نوکری اور لگی بندھی تنخواہ چھوڑ کر ایک نئے کاروبار کے ساتھ منسلک ہونا ایک مشکل فیصلہ ہو سکتا تھا مگر خاموش صاحب نے چند لمحوں میں یہ فیصلہ کر ڈالا اور اپنا ساز و سامان لے کر نئے دفتر میں آ براجمان ہوئے۔ خدا کی کرنی یہ ہوئی کہ پہلے ہی کاروباری منصوبے میں ان کے پرانے ساتھی اور نئے باس کو خسارہ ہو گیا۔ سو ایک برس میں یہ کاروبار بند کرنا پڑا۔

خاموش صاحب پھر سڑک پر تھے۔ اوپر آسمان تھا اور سامنے سنگلاخ راستہ اور جانا بھی دور تھا۔ ایسے میں ان کی بیوی ان کی مدد کو نہ آتی تو شاید وہ ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ اس خدا کی بندی نے ان کا حوصلہ خوب بڑھایا اور پھر ایک روز ڈرتے ڈرتے ایک تجویز ان کے سامنے رکھی۔ تجویز سن کر وہ کچھ دیر تو سوچتے رہے۔ پھر بول پڑے ''فرزانہ لوگ کیا کہیں گے کہ خود تو زندگی میں ناکام ہو گیا اور پھر اپنی بیوی کو پڑھا لکھا کر اس کی روزی کترنے لگا۔ نہ بھئی نہ۔'' انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔

فرزانہ پھٹ پڑی ''آپ بھی زمانہ جاہلیت کی باتیں کرتے ہیں۔ آج جب آپ سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں تو ان سب لوگوں کو آپ کا خیال کیوں نہیں آتا۔ کیا کوئی آیا آپ کی مدد کو؟ پھر اور لوگوں کو تو چھوڑیئے، ابھی کل جب آپ اپنے پرانے دفتر' ملازمت کی تلاش

میں گئے تھے تو کیا کسی نے آپ کی پرانی خدمات کا لحاظ کیا؟ کس بے مروتی سے ٹکا سا جواب دے دیا۔"

"ابھی تو چھ ماہ ہی ہوئے ہیں۔ اللہ کارساز ہے۔ کوئی راستہ نکال دے گا۔ دنیا بے مروت ہوگئی ہے تو اس کے ساتھ مجھے تو بے لحاظ نہیں ہوجانا چاہیے۔" خاموش صاحب ہکلائے۔

"میں تو صرف اتنا ہی کہہ رہی ہوں کہ شام کے ڈپلومے میں داخلہ لے لیتی ہوں۔ کچھ پڑھ لکھ ہی لوں گی۔ اگر اس دوران آپ کو معقول نوکری مل گئی تو بھی پڑھ لکھ کر گھر بیٹھ رہوں گی۔ نہیں کروں گی نوکری۔" فرزانہ نے دلیل دی۔

اس دلیل کا خاموش صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آخرکار فرزانہ نے داخلہ لے لیا اور خاموش صاحب نے تلاشِ معاش جاری رکھی۔ فرزانہ کا ڈپلومہ مکمل ہوگیا لیکن خاموش صاحب کو نوکری نہ ملنا تھی نہ ملی۔

ادھر فرزانہ کا ڈپلومہ مکمل ہوتے ہی اس پر نوکریوں کی بھرمار ہوگئی۔ ایک تو بالکل نیا مضمون تھا جس کی مارکیٹ میں خاصی مانگ تھی اوپر سے عورتوں میں اس مضمون کی طرف آنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا اور پھر نئے دور کی بین الاقوامی کمپنیاں اپنا دفتری ماحول خوشگوار بنانے اور جدید تقاضوں کے مطابق خواتین کی معقول تعداد کو ملازمت میں رکھ رہی تھیں۔ ویسے فرزانہ نے ڈپلومہ پاس بھی امتیازی نمبروں کے ساتھ کیا تھا۔ حسین تو وہ تھی ہی اوپر سے ذہین بھی بہت تھی۔ اس کا یہی حسن خاموش صاحب کو کھٹکتا تھا' انہیں احساس عدم تحفظ کا شکار کرتا تھا۔

ایک روز رات کو خاموش صاحب کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے فرزانہ نے ڈرتے ڈرتے، کہ وہ جانتی تھی کہ جو بات شوہر سے کھانے کی میز پر نہ منوائی جاسکتی ہو بستر میں منوائی جاسکتی ہے، التجائیہ لہجے میں کہا "سُنئے" پھر لحہ بھر رک کر دنیا جہان کا پیار اپنی آواز میں سموتے ہوئے بولی' آپ کو وہ رات یاد ہے' ہماری پہلی رات، جب آپ نے مجھ سے تعاون مانگا تھا۔ میں تو آپ سے تعاون کرنا چاہتی ہوں مگر آپ مانتے ہی نہیں۔ اگر میں نوکری کرلوں گی تو کون سی قیامت آجائے گی۔ آخر میری بہت سی سہیلیاں بھی تو نوکریاں کر ہی رہی ہیں۔ پھر میں آپ سے نوکری کی اجازت کا تقاضا نہ کرتی اگر ضرورت نہ ہوتی۔ آپ ماشاءاللہ چالیس برس سے اوپر کے

ہو چکے ہیں۔اب نئے سرے سے تو زندگی شروع نہیں کی جاسکتی نا۔ پھر اگر خدا کرے آپ کو جلد نوکری مل بھی جائے تو بھی گھر بنانے کے لیے جتنے پیسے چاہئیں ان کو آپ اکیلے کی تنخواہ سے تو اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔"

خاموش صاحب پھٹ پڑے" ہاں ہاں صرف تعاون مانگا تھا۔نہیں چاہیے مجھے ایسا گھر جس میں میری عورت کی کمائی شامل ہو۔"

فرزانہ بھی تو تکار کے موڈ میں تھی" تو پہلے ہی مجھے یہ بات بتا دی ہوتی۔اتنی امیدیں تو نہ لگاتی۔اور نہیں تو ایک بچہ ہی ہو گیا ہوتا۔کل کو کیا میرے بچے بھی اپنے گھر کے بغیر پلیں گے؟ کیا ہم ساری زندگی اپنی چھت کو ترسیں گے؟" فرزانہ کے لہجے میں غصے کے ساتھ بناوٹ کا رنگ بھی گھلا ہوا تھا۔

"میں نے انکار کر دیا ہے۔ بیوی کی کمائی مجھ پر حرام ہے۔" خاموش صاحب نے سپاٹ لہجے میں گویا بات ختم کر دی۔

فرزانہ یہ سن کر تلخ لہجے میں گرجی "میں کون سا جا کر کوٹھے پر بیٹھ رہی ہوں۔ باعزت نوکری کا ہی کہہ رہی ہوں۔خدایا' اتنا احساس کمتری۔ اتنی کمزوری۔"

کوٹھے کا لفظ سن کر خاموش صاحب اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور ایک زوردار تھپڑ اپنی بیوی کو رسید کر دیا۔ازدواجی زندگی کا پہلا طمانچہ کھا کر فرزانہ کچھ دیر تو ہکا بکا رہ گئی' پھر سسکیاں لیتی ملحقہ کمرے کو دوڑی، دروازے کی چٹخنی اندر سے لگا کر پلنگ پر جا گری اور تکیے میں منہ دے کر رونے لگی۔

کچھ دیر کے لیے تو خاموش صاحب سُن ہو کر رہ گئے، پھر ندامت غالب آگئی۔کافی شرمندگی محسوس کرتے رہے۔آخر کار بوجھل دل سے اٹھے اور اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے مگر فرزانہ نے دروازہ نہ کھولا۔

رات ڈھلنے لگی۔باہر پودے پتوں پر اداس اترنے لگی۔

آخر کو خاموش صاحب دھیمی آواز میں واسطوں اور منتوں کے بعد خوشامد پر اتر آئے لیکن دروازہ بند رہا۔

سویرے جب صبح کی اذان کے بعد دروازہ کھلا تو فرزانہ سوجی آنکھوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ خاموش صاحب کے سینے سے آلگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خاموش صاحب نے فرزانہ کے سر کو سہلانا شروع کر دیا۔ ''چلو معاف کر دو۔ جیسی تمہاری مرضی، کل ہی سے نوکری شروع کر دو مگر وعدہ کرو کہ اگر گھر جتنے پیسے اکٹھے ہو گئے تو پھر نوکری چھوڑ دو گی اور دوبارہ یہ ضد نہیں کرو گی۔''

فرزانہ روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور تائید میں سر ہلانے لگی۔

جب فرزانہ کے پہلے ماہ کی تنخواہ گھر آئی تو جیسے خشک بنجر زمین پر سبزے کی بہار آ گئی ہو۔ خاموش صاحب نے، جو پچھلے دو ایک ماہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی مانگ تانگ کر گزارہ کر رہے تھے، قرض چکایا۔ پھر بقایا رقم سے گھر کا ضروری سامان خریدا گیا۔ تنخواہ معقول تھی اس لیے ضروری واجبات کی ادائیگی ہوگی۔ ادائیگی تو ہوگئی مگر خاموش صاحب کے سینے پر جیسے ایک بوجھ سا پڑ گیا۔ وہ اسم بامسمیٰ ہو گئے۔ کچھ زیادہ ہی خاموش ہو گئے جیسے بجھ سے گئے ہوں۔ دوسری طرف فرزانہ کھل اٹھی تھی۔ اپنی تنخواہ اور کمائی کا نشہ ہی اور تھا۔ اوپر سے اس کے دفتر میں اس سے خصوصی سلوک کیا جارہا تھا۔ وہ اسے اپنی محنت کا ثمر سمجھتی تھی۔ اپنے حسن اور قدرتی اداؤں کی طرف اس کا ذہن ہی نہیں گیا۔ اس کا ہینڈسم جوان باس تو گویا اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے باس کی پرستائش گفتگو کا خاموش صاحب کو بتایا تو ان کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا اور چہرہ متغیر ہو گیا۔ ان کا بدلتا موڈ دیکھ کر فرزانہ نے زنانہ دانشمندی سے موضوع بدل دیا لیکن پھر دوبارہ کبھی اپنے دفتر کے کسی ساتھی یا اپنے باس کی اپنے لیے تعریف کا ذکر نہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

چوتھے ماہ کی تنخواہ آئی تو اس میں انکریمنٹ بھی شامل تھا۔ ضروری سامان کی خریداری اور باقاعدہ بلوں کی ادائیگی کے بعد بھی مناسب رقم بچ رہی۔ اب فرزانہ کے رویئے میں اعتماد آ گیا تھا۔ گھریلو ماحول کی گھٹن سے نکل کر جب اسے باہر کی کھلی فضا میسر آئی تو اس کا رنگ روپ نکھرنے لگا۔ اس کا چنچل پن، جو اب تک ازدواجی زندگی کی راکھ میں چنگاری بن کر چھپا ہوا تھا، بھڑک

اٹھا۔اس کے دفتر کے وہ ساتھی جو کبھی دفتر وقت پر نہ آتے تھے اور اگر کبھی تکلفاً وقت پر آ بھی جاتے تھے تو اس حالت میں ہوتے جیسے بستر سے سیدھے نکل کر آ رہے ہوں، یوں سوٹڈ بوٹڈ دفتر آنے لگے جیسے روزانہ دفتر میں کوئی ضروری رسمی تقریب ہو۔ اس کے سامنے بیٹھنے والے ادھیڑ عمر شیخ صاحب نے، جن کے سامنے کے دو دانت غائب تھے اور جب وہ بولتے تھے تو جیسے سیٹی سی بجتی تھی، مصنوعی دانت لگوا لیے۔ ادھر ٹیلی فون پر بیٹھنے والی شائستہ تو جیسے جل کر کباب ہو گئی۔ اب اُس کو ملنے والی توجہ بھی فرزانہ کو مل رہی تھی۔ باس کے اطوار بھی بدل گئے تھے۔ وہ پہلے ہی ایک خوش پوش جوان تھا۔ مگر اب تو اس کے چہرے پر باقاعدہ رعنائی آ گئی تھی اور اطوار میں بانکپن عود کر آیا تھا۔

آخر کار چند ماہ بعد خاموش صاحب کو بھی اپنے دفتر میں نوکری مل گئی مگر ان کی تنخواہ معقول نہ تھی۔ ویسے بھی فرزانہ کی تنخواہ سے اتنی رقم پس انداز ہو رہی تھی کہ اگر اس کی ساری تنخواہ پس انداز ہوتی رہتی اور خاموش صاحب کی تنخواہ سے گھریلو اخراجات پورے کیے جاتے تو دو ایک برس میں وہ ایک چھوٹے سے پلاٹ کی ابتدائی ادائیگی کرنے کے قابل ہو جاتے۔ یہ خوشگوار صورتحال دیکھتے ہوئے خاموش صاحب نے فرزانہ سے اپنی شرط کہ ان کو نوکری ملتے ہی وہ نوکری چھوڑ دے گی، زیادہ شدومد سے نہ دہرائی۔

فرزانہ کی فرم بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور فرم کے مالکان نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی ایک شاخ دبئی میں کھول دی جائے۔ اس نئی شاخ کے لیے قرعہ فال جن لوگوں کے نام نکلا ان میں فرزانہ کے باس کے علاوہ اس کا نام بھی شامل تھا۔ یقیناً وہ فرم کی انتظامیہ کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کو ذمہ داری سونپی گئی کہ اگلے تین ماہ میں دبئی میں نیا دفتر سیٹ کر کے کام شروع کر دیا جائے۔ فرزانہ نے ابتداً یہ خبر خاموش صاحب سے مصلحتاً چھپائی۔ ویسے بھی گھر کا تصور کر کے خاموش صاحب کے مزاج میں ایک خوشگوار تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ جب فرزانہ کے پاس کوئی اور چارہ نہ رہا تو ایک رات سونے سے ذرا پہلے اس نے خاموش صاحب کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے انہیں خوشخبری سنائی کہ اس کی تنخواہ اصل سے کئی گنا بڑھائی جا رہی ہے۔ جب انہوں نے خوشگوار حیرت سے وجہ پوچھی تو فرزانہ نے انہیں خوشی سے سرشار لہجے میں بتایا کہ

اسے دبئی بھیجا جارہا ہے۔ اس خاص پراجیکٹ کے لیے اسے تین ماہ دبئی میں رہنا ہوگا اور اس کی تنخواہ درہموں میں ادا کی جائے گی۔ واپسی پر اس کی بیرونی تنخواہ برقرار رکھی جائے گی۔

یہ خبر سن کر خاموش صاحب چپ ہو گئے۔

اس نے بہت لاڈ سے پوچھا۔"جان! آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا میری ترقی سے جل گئے؟"اس کے لہجے میں بناوٹ اور پیار بھرا طنز تھا۔

"نہیں جلنا کیا ہے۔ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ میری عمر اب بڑھتی جارہی ہے' گھر بھی بنتا نظر آرہا ہے' تم تو ابھی جوان ہو لیکن۔۔۔"انہوں نے لمبا سانس لیا۔

"لیکن کیا؟"اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

"لیکن یہ کہ ان دنوں سوچ رہا ہوں کہ اپنے خاندان کو بڑھا لیا جائے۔"انہوں نے بات مکمل کی۔

"خاندان تو بعد میں بھی بڑھایا جاسکتا ہے۔ ابھی تو گھر بھی بنانا ہے۔ خود ہی سوچیں کہ اگر میں نے اس آفر کا فائدہ اٹھا لیا تو بہت جلد، اپنی توقع سے بھی پہلے' ہم اپنا گھر مکمل کر لیں گے۔ بعد میں خاندان بھی بڑھاتے رہیں گے۔"اس کے لہجے میں خوشامد اور منت تھی۔"پلیز جان' پلیز' ہاں کر دیں۔"

"ہاں"خاموش صاحب کے منہ سے یہ ہاں ایک لمبی آہ کی صورت میں نکلی۔

جب تین ماہ بعد فرزانہ دبئی سے واپس آئی تو خاموش صاحب کو گھر میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ پہلے بھی وہ گھر پر ہوتے ہوئے زیادہ تر دفتر سے متعلقہ خیالات میں کھوئی رہتی تھی۔ خاموش صاحب اور فرزانہ کے بیچ عجیب لاتعلقی سی در آئی تھی' شیشے کی ایک دیوار سی آ گئی تھی۔ پھر وہ پلاٹ کی تلاش اور خریداری میں بھی کچھ مصروف ہو گئے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے پلاٹ کی ادائیگی بھی کر دی گئی۔ اس روز خاموش صاحب بہت خوش تھے۔ پلاٹ ایک اچھی جگہ پر بہت اچھے داموں میں آسان اقساط پر مل گیا تھا۔ بہت جلد وہاں بنیادیں کھودی جانے لگیں۔

برسات ابھی دور تھی لیکن خاموش صاحب چاہتے تھے کہ برسات آنے سے پہلے دیواریں کھڑی کر دی جائیں کہ برسات میں پانی بنیادوں میں بھر جاتا ہے۔

اس دوران وہ تعمیر میں اتنے منہمک ہوئے کہ دفتری کام پر پوری توجہ نہ دے پائے۔ اس کے نتیجے میں ان کی کئی مرتبہ سرزنش کی گئی مگر وہ تو تعمیر کے نشے میں اس طرح چور تھے کہ ایسی کسی بھی سرزنش کو خاطر میں لانے کا مطلق کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ ایک روز یہ حادثہ بھی ہو گیا کہ ان کو اس نوکری سے جو خدا خدا کر کے ملی تھی، فارغ کر دیا گیا۔ یہ حادثہ وہ ایک کڑوے گھونٹ کی طرح پی گئے مگر اس کو دل سے نہ لگایا اور نہ ہی اعصاب پر سوار کیا۔ بھلے ان کی نوکری چلی گئی تھی مگر فرزانہ کی نوکری تو برقرار تھی بلکہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔

ان کی نوکری سے برطرفی کی خبر سن کر فرزانہ نے ان کو بہت حوصلہ دیا اور ان کا دل بڑھایا اور ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ اب وہ اپنی تمام تر توانائیاں گھر کی تعمیر پر صرف کریں۔ اب تک اس کا لب ولہجہ معذرت خواہانہ اور مودبانہ ہونے کی بجائے تحکمانہ ہو گیا تھا۔

اس روز صبح سویرے ہی ایک دم بارش شروع ہو گئی۔ ابھی ٹھیکیدار اور مزدور کام پر نہ آئے تھے۔ خاموش صاحب کچھ دیر ان کا انتظار کرتے رہے مگر پھر مایوس ہو کر گاڑی میں گھر کی طرف چل دیئے۔ یہ گاڑی فرزانہ نے ان کو قسطوں پر تحفتاً لے کر دی تھی جو اُس روز کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے دوسرے شہر کا بتا کر گئی ہوئی تھی۔

ابھی وہ رستے ہی میں تھے کہ انہیں خیال آیا کہ گھر جا کر بور ہونے کی بجائے کیوں نہ وہ قریب ہی واقع فائیو سٹار ہوٹل میں چائے پی لیں۔ ویسے بھی ان کے اعصاب کو سکون کی ضرورت تھی۔

ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے ان کی ایک سرسری سی نظر اوپر واقع رہائشی کمروں سے نیچے کو آتی شیشے کی کیپسول لفٹ پر جا پڑی۔

کچھ دیر کے لیے ان کی نظر لفٹ پر جم کر رہ گئی۔ اُترتی لفٹ کی جھلک میں فرزانہ اپنے بالوں کو درست کر رہی تھی۔ ساتھ میں ایک جوان مرد بھی تھا۔

خاموش صاحب نے گھبرا کر اپنی نگاہ دوسری جانب کر لی اور سوچا' نظریں بھی کیسا

دھوکہ دیتی ہیں۔"

باہر بارش رک چکی تھی۔

مزدور اب پلاٹ پر آ چکے تھے اور بیزاری سے خاموش صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔

شرط

اُس دلچسپ شرط کے نتیجے میں اب وہ دونوں ریستوران میں سامنے بیٹھے ہوئے ہیرو اور اُس لڑکی کو کن انکھیوں سے بھانپ رہے تھے۔

سامنے کی میز پر ہیرو اُس لڑکی کے ساتھ بیٹھا بہت رومانوی انداز میں اُس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا لیکن لڑکی تھی کہ ہیرو کی نگاہوں کی گرفت سے اُس کی نگاہیں ایک گیلی مچھلی کی طرح پھسل پھسل جاتی تھیں۔ کبھی وہ اِدھر دیکھتی تو کبھی اُدھر مگر ہیرو کی آنکھوں میں دیکھنے سے مسلسل گریزاں تھی۔

ہیرو سوا پانچ فٹ قد، جلے گُڑ کی رنگت، چھوٹی چھوٹی سیاہ چمکدار آنکھوں، خشک بالوں اور بغیر گردن والا معمولی شکل کا جوان تھا۔ اُس کے سامنے بیٹھی لڑکی شفاف سُرمئی بڑی بڑی حیران آنکھوں کی مالک تھی جس کی کشادہ پیشانی پر ایک جانب سے براؤن بالوں کی لٹ گِر گِر جاتی تھی۔ وہ اپنے سرخ ہونٹوں کو دُودھیا دانتوں سے بار بار کاٹتی تھی۔ ریستوران کی مدھم روشنی میں کانوں میں لٹکتے آویزے اُس کی لمبی مرمریں گردن پر جھولتا سا سایہ ڈالتے تھے۔

ریستوران کے خواب ناک ماحول میں اعلیٰ خوراک کی خوشگوار مہک میں کافی کے

چاکلیٹی دانوں کے بڑ دکیے جانے کی مخصوص خوشبو گھل مل رہی تھی۔

پس منظر میں جدید میوزک سسٹم سازوں کی مدھر موسیقی کانوں میں نرمی سے انڈیل رہا تھا۔میزوں کے بیچ سفید دستانے پہنے سبک رفتار بیرے سایوں کی طرح پھسل رہے تھے۔

اندر کے گرم خوش گوار ماحول سے اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ باہر قیامت کی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔

ہیرو اور وہ لڑکی مدھم آواز میں باتیں کررہے تھے۔ ہیرو نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھے ہوئے تھے جبکہ لڑکی نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ سا اپنی گود میں گرا کر انھیں نیچے چھپا رکھا تھا۔

ساتھ کی میز پر بیٹھے وہ دونوں جوان دلچسپی بھری کن انکھیوں سے اس جوڑے کو دیکھ رہے تھے اور کافی دیر سے آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔

''زیادہ گھور کرمت دیکھو۔ کہیں بھابھی کو شک نہ ہو جائے۔'' اُن میں سے پہلا بولا۔

''بھابھی اتنی حسین ہے کہ اسے تو ایسی نگاہوں کی عادت سی ہوگئی ہوگی۔'' دوسرا بولا۔

''یار ہم اسے بہت دیر سے بھابھی کہہ رہے ہیں جبکہ ہیرو ابھی تک اس کا ہاتھ تھامنے میں تو کامیاب ہونہیں سکا۔'' پہلا بولا

''بھابھی تو ہم تکلفاً کہہ رہے ہیں۔ ورنہ ہیرو تو اب تک کئی لڑکیوں کو پیار کے سبھی سبق پڑھا کر بھابھی کر چکا ہے۔'' دوسرا مسکرایا

''یوں دکھتا ہے کہ ہم شرط جیت چکے ہیں۔ بھلا اس جدید دور میں جب لڑکا لڑکی پہلی باقاعدہ ملاقات سے پہلے موبائل فون ہی پر محبت کے کئی مراحل طے کر چکے ہوتے ہیں، یہ ان دونوں کی دوسری ملاقات ہے اور گاڑی ابھی اسٹارٹ ہوتے ہوئے پھٹپھٹا رہی ہے۔ بات آگے بڑھنے کی نہیں ہے۔''

''دوست یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہم نے شرط بھی تو اسی لیے لگائی ہے کہ پوری طرح معلومات حاصل کرلی تھیں۔لڑکی ہیرو بھائی کی ٹائپ کی نہیں ہے، حسین اور شریف تو ہے ہی مگر گڑبڑ تو یہ ہے کہ سمجھدار بھی ہے۔'' دوسرے نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اگر اتنی ہی شریف ہے تو اکیلے میں غیر لڑکے سے کیوں ملنے چلی آئی؟'' پہلے نے

استفسار کیا۔

"اب پرانے دور کی باتیں مت کرو جب لڑکی لڑکے کو دیکھ کر چھوئی موئی ہو جاتی تھی۔ آخر بھابھی ایک مناسب سی میوزک کمپنی میں جاب کرتی ہے۔ روزانہ کئی مردوں سے ملتی ہے۔ پھر بھائی تو پرانا کلائنٹ ہے اور باتوں کا دھنی بھی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ کہتا آیا ہے کہ اگر لڑکی کو گرفت میں رکھنا ہے تو اپنی زبان کی دھار کو تیز رکھو۔" دوسرا مسکرا کر بولا۔ پھر اُس نے بات جاری رکھی۔

"ہیرو بھائی دیکھنے میں تو خاص نہیں۔ مگر اُس کا کہنا ہے کہ مرد عورت کے حُسن سے تب تک مسحور رہتا ہے جب تک اُسے زیر نہیں کر لیتا۔ بھائی کہتا ہے کہ گو ہر عورت شروع میں مردانہ وجاہت سے متاثر تو ضرور ہوتی ہے مگر شخصیت اور گفتگو کا فن کچھ ہی عرصے میں عورت کے لیے وجاہت پر حاوی ہو جاتا ہے۔"

"بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ ماہ سے تعلق اور ایک ماہ میں دوسری ملاقات پر بھی ہیرو بھائی بھابھی کو کیوں اپنی جانب مائل نہیں کر سکا؟" پہلے کے معصومانہ استفسار پر دوسرا ہنس پڑا۔

"اسی بات پر تو شرط لگائی ہے ہم نے بے وقوف۔ پہلے تو ہمیں یہی یقین نہیں تھا کہ ہیرو بھابھی کو مل رہا ہے۔ کیوں کہ بھابھی کے حُسن کا چرچا تو چلو پورے سرکٹ میں ہے ہی پر اس بات کا شہرہ بھی ہے کہ وہ شاید ہی کبھی کھانے پر باہر مل لیتی ہو مگر اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ چلو اب اپنی آنکھوں سے دونوں کو ملتے تو دیکھ لیا مگر ہیرو بھائی اب تک بھابھی کا ہاتھ تھامنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور شرط بھی اسی بات پر ہے۔" دوسرے نے گویا اسے سمجھایا۔

"اب میں اتنا بھی سادہ نہیں۔ آخر ہم نے شرط سوچ سمجھ کر اور پوری تسلی کر کے لگائی ہے۔ پر ہیرو کا بھابھی کے ہاتھ کو پکڑنا اتنا اہم کیوں ہے کہ تُم مجھے بھی شرط میں گھسیٹ لائے۔" پہلے نے شرارت سے پوچھا۔

"تم رہے نا بُدھو کے بُدھو۔ دراصل میں نے بھائی کا داؤ بھائی ہی پر آزمایا ہے۔ وہ تربیت کے دوران مجھے کئی مرتبہ سمجھا چکا ہے کہ ماڈرن لڑکی جدید کپڑوں میں کھانے پر آ ہی جاتی ہے۔ ساتھ بیٹھ کر سگریٹ بھی پی لیتی ہے، ہنستے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ بھی مارتی ہے اور ساتھ میں چلتے

ہوئے کمر کے گرد بازو بھی ڈالنے دیتی ہے۔ مگر جب اس سے آگے بڑھو تو ہاتھوں سے پھسل جاتی ہے۔ بھائی کہتا ہے کہ اس کے برعکس روایتی لڑکی اوّل تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتی۔ اگر بات کر ہی لے تو آرام سے کھانے پر ساتھ نہیں چلتی اور اگر کھانے پر ساتھ چل پڑے تو ہاتھ نہیں تھامتی۔ اور اگر شومئی قسمت سے ہاتھ تھام لے تو پھر' یہاں پہنچ کر دوسرے نے چٹکی بجائی۔

''اور اگر ہاتھ تھام لے تو پھسل کر فوراً ہی گود میں آن گرتی ہے۔''

دوسرے نے توقف کیا' پُرسوچ انداز میں پہلے کی آنکھوں میں جھانکا اور بات جاری رکھی۔

''ہیرو بھائی پچھلے ایک گھنٹے سے اپنے خودساختہ محروم بچپن پر مشق کردہ ٹیپ چلا چکا ہوگا۔ پھر لڑکی کو ہنسا بھی چکا ہے کہ اُس کا کہنا ہے کہ لڑکی کی ایک ہنسی کئی دِنوں کے فاصلوں کو طے کر لیتی ہے اور اب یقیناً کوئی رومانٹک بات کر کے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کر رہا ہے مگر بھابھی کو دیکھو وہ بھی سمجھدار لڑکی ہے۔ کھانا ختم ہو چکا ہے اور وہ ویٹر کو بلا کر شاید کافی کا آرڈر بھی دے چکے ہیں مگر بھابھی اپنے ہاتھ میز پر رکھے ہی نہیں دے رہی۔'' دوسرا شرط قریباً جیت لینے کی خوشی سے معمور لہجے میں بولا۔

ابھی اُن کی باتیں جاری ہی تھیں کہ ریستوران کے دھیمے ماحول میں سرسراہٹ سی ہوئی۔

ہوٹل کا منیجر بڑے پُرمسرت انداز میں صدر دروازے کی جانب لپکا اور اندر داخل ہوتے وجیہہ مہمان کا کوٹ تھام کر قریبی کوٹ ہینگر کی جانب چل دیا۔

ہیڈ ویٹر نے اُس خاص مہمان کی ایک مخصوص میز تک راہنمائی کی، نشست پیچھے کی جانب سرکائی، اس کے بیٹھنے پر جیب سے لائٹر جلا کر میز پر رکھی موم بتی روشن کی اور قریب میں مودّب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

ہوٹل کے قریباً سبھی مہمان جو اُس مشہور شخص کی طرف دیکھ رہے تھے' گویا خواب سے باہر آئے اور اس بے اعتنائی سے اپنی میزوں کی جانب پھر سے متوجہ ہو گئے جو اُوپر لے درجے کے

لوگوں کا خاصہ ہے جب وہ کسی معروف شخصیت کو دیکھ کر ابتدائی اشتیاق پر مصنوعی بے اعتنائی کا اوور کوٹ اوڑھ لیتے ہیں۔

ہیرو کے سامنے بیٹھی لڑکی خوشی سے پکار اٹھی اور ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

''آپ کے پیچھے مشہور سنگر شہریار علی خاں آ بیٹھے ہیں۔ کیا شاندار پرسنالٹی ہے اور پھر کتنی میچورٹی ہے ان میں۔ میرے پاس ان کے سبھی البم ہیں۔ کتنا دل سے گاتے ہیں۔ میری کمپنی کو تو اپائنٹمنٹ ہی نہیں دیتے پر میں تو بس ان کی دیوانی ہوں۔''

یہ سُن کر ہیرو پھیکی مسکراہٹ مسکرایا اور پیچھے مڑنے ہی والا تھا کہ گلوکار ہاتھوں کو ملتا اُن کے قریب سے گزرتا واش روم کی جانب چلا گیا۔

ہیرو ایک دم سے سنبھلا، چند ثانیے کے لیے کچھ سوچا، اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ لڑکی سے معذرت کر کے واش روم کی جانب چل دیا۔

ساتھ کی میز پر یہ دونوں بھی لڑکی کے مچل اٹھنے پر مسکرا دیے۔

''سوبر سے سوبر لڑکی کے اندر بھی ایک چنچل بچی ہوتی ہے۔ نہ جانے کیوں یہ لڑکیاں سنگرز کے پیچھے پاگل ہوتی ہیں۔'' پہلے نے دوسرے کو کہا۔

اِدھر واش روم میں ہیرو بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اندر ایک کیبن میں فلش چلنے کی آواز آئی اور مشہور گلوکار متانت سے اندر سے چلتا ہوا برآمد ہوا۔ اُس نے سامنے لگے بیسن پر نصب بٹن کو ایک ہاتھ سے دبایا اور دوسرے ہاتھ کو اس کے نیچے کر دیا۔ اندر سے خوشبودار صابن مائع شکل میں ٹپکنے لگا۔ پھر اس نے خودکار نلکے کے نیچے ہاتھ رکھا جس میں سے بھاپ اڑاتا نیم گرم پانی بہنے لگا۔

ہیرو قریب میں کھڑا یہ سب کچھ بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک پُر اعتماد مسکراہٹ تھی۔

جب ہینڈ ڈرائر پھرر کی آواز سے چلنے لگا تو ہیرو آگے بڑھا اور بہت لجاجت سے گلوکار سے مخاطب ہوا۔

''سر میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کو اپنے سامنے دیکھ

رہا ہوں۔ سر آپ تصویروں میں جتنے اچھے نظر آتے ہیں اصل میں تو اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہینڈسم ہیں۔ پھر آپ کی آواز تو سونے میں ڈھلی ہوئی ہے۔"

یہ سن کر گلوکار عاجزی سے مسکرادیا۔

اس پر ہیرو نے ہمت باندھی اور اپنی آواز میں مزید مرعوبیت بھر کر بولا۔

"سر میری آپ سے ملنے کی بہت خواہش تھی مگر آپ پبلک سے گھلنا ملنا تو دُور کی بات ہے کسی اخبار یا چینل کو بھی انٹرویو نہیں دیتے۔ کچھ لوگ اس پر اعتراض بھی کرتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ آپ سستی شہرت سے بہت دور ہیں۔"

اس پر گلوکار شکریہ ادا کر کے آگے بڑھنے ہی کو تھا کہ ہیرو ہاتھ باندھ کر سامنے آن کھڑا ہوا۔

"سر ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔"

"فرمایئے" گلوکار نے بھاری آواز میں کہا۔

"سر آج میں اپنی منگیتر کے سامنے کھانے پر آیا ہوا۔ وہ آپ کی مجھ سے بھی بڑی فین ہے۔ آپ کو دیکھ کر وہ تو مچل گئی ہے اور آٹوگراف کی ضد کر رہی ہے۔ سر میں اُسے بہت پیار کرتا ہوں۔ سر...... سر...... سر"

یہاں پہنچ کر ہیرو کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے اور اُس کی آواز بھرا گئی۔

گلوکار اُسے نرم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"سر اگر آپ چند لمحوں کے لیے میری میز پر آ جائیں اور مجھے میرے نام سے یوں پکار لیں جیسے کہ آپ مجھے پرانا جانتے ہیں تو......"

"مگر میں تو آپ کو نہیں جانتا۔" گلوکار نے نرمی سے ہیرو کی بات کاٹی۔

"وہ تو سچ ہے سر...... میں جانتا ہوں کہ آپ گوشہ نشین ہیں۔ مگر یقین جانئے کہ آپ کے اس چھوٹے سے عمل سے میری عزت میری منگیتر کی نظروں میں بہت بڑھ جائے گی اور وہ ہمارے بچوں کو فخر سے بتایا کرے گی 'گڈو تمھارے پاپا کے دوستوں میں وہ والے سنگر انکل بھی ہیں' اور سر اس پر گڈو بھی خوش ہو جایا کرے گا سر۔" اس پر گلوکار مسکرادیا۔ پھر اُس نے کچھ دیر سوچا

اور بولا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

ہیرو خوشی سے اُچھل پڑا اور جذباتی لہجے میں اپنا نام بتا کر اور یہ درخواست کر کے کہ گلوکار تھوڑے وقفے سے باہر آئے، ہانپتا ہوا باہر کو بھاگا۔

چند لمحوں بعد جب گلوکار باہر نکلا تو سامنے ہیرو بہت شائستگی اور سنجیدگی سے اُس لڑکی کے ساتھ دھیمی آواز میں محوِ گفتگو تھا۔

کن اَنکھیوں سے گلوکار کو اپنی میز کی جانب آتا دیکھ کر ہیرو مزید محتاط ہو گیا۔

ساتھ کی میز پر بیٹھے وہ دونوں بھی اتنے معروف صدارتی انعام یافتہ گلوکار کو ہیرو کی میز کی طرف بڑھتا دیکھ کر چونک گئے۔

ویٹر بھی چوکنے ہو گئے۔

جب گلوکار ہیرو کی میز کے سرے پر پہنچا اور ہیرو کو اُس کے ابتدائی نام سے پکارا تو ہیرو نے آہستگی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھی لڑکی کی آنکھوں میں حیرت بھری وارفتگی دَر آئی۔

ہیرو کی آنکھوں میں درشتی بھر آئی اور وہ دھیمے سے چلّا اُٹھا۔

"شیری تم پھر آ گئے۔ میں کوئی ضروری بات کر رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب کر دیا ہمیشہ کی طرح۔ چلو جاؤ بیٹھو اپنی میز پر۔"

گلوکار کو گویا اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ وہ کچھ دیر ہکا بکا بُت بنا کھڑا رہا اور اُس کا مسکراتا چہرہ اس طرح بگڑ گیا جیسے اس بچے کا بگڑتا ہے جو مزے میں ہو اور اس کے منہ سے فیڈر کھینچ لیا جائے۔

"ہمیشہ موڈ خراب کر دیتا ہے۔" ہیرو غصّے میں بڑبڑایا۔ اس کے میز پر پڑے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

لڑکی نے پہلے حیرت سے گلوکار کو مڑتے دیکھا پھر اُس کی آنکھوں میں حیرت کی چادر چکنا چور ہوئی اور اس کے پیچھے سے نرم اپنائیت کا ایک سورج طلوع ہوا۔

اُس نے بے اختیار اپنے ہاتھ گود سے اٹھائے اور ہیرو کے میز پر دھرے کانپتے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔

"چلیں چھوڑیں۔ جانے بھی دیں۔" اُس نے سرگوشی کی۔

ہیرو کا چہرہ نارمل ہونے لگا۔

اُس نے ایک آنکھ کے کونے سے حقارت سے مڑتے گلوکار کو دیکھا اور دوسری آنکھ کے کونے سے سامنے بیٹھے دونوں دوستوں کو دیکھا جن کے چہرے الگنی پر ٹنگے بھیگے کپڑوں کی طرح لٹک رہے تھے اور لڑکی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

(سُنی بات)

انتظار

خبر تو ایک تھی مگر لوگ دو۔

رات کو ہُو کا عالم تھا

اِدھر وہ کافی دیر سے بس سٹاپ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ فضا میں ابھی تک جھینگے، مچھلی لے کر جانے والے کھلے ٹرکوں کے گزرنے کی وجہ سے بساند باقی تھی۔ سامنے صرف ایک پی۔سی۔او کھلا تھا جس کے اندر سے ٹیوب کی سوگوار ٹھنڈی سفید روشنی شیشے کے دروازے کھڑکیوں سے باہر جھانک رہی تھی۔ اندر میز پر سر ڈالے، گردن پر مفلر لپیٹے ایک شخص غالباً سو رہا تھا یا پھر کچھ سوچ رہا تھا۔

اُسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ دو روز بعد اُس کے بیٹے کا امتحان شروع ہو رہا تھا، اور اُسے گھر جا کر بیٹے کو پڑھانا تھا۔

اُدھر کاشان اپنے ابا کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے دن بھر کی پڑھائی کے بعد ریاضی کے کچھ سوالوں پر نشان لگا رکھے تھے۔ یہ وہ سوال تھے جو وہ حل نہ کر پایا تھا۔ اُس کے سامنے کتابیں کھلی پڑی تھیں اور اُن کے اوراق کھڑکی سے آتی سمندری ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ کاشان

اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا تو، دن بھر زمین پر بیٹھ کر پڑھنے کی وجہ سے، وہ کنکنا اُٹھے۔

اُس نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی اور پھولدار پردہ اُس کے سامنے کھینچ لیا۔

کمرے کی فضا تھم گئی۔

اب وہ کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ چلتے چلتے وہ دن بھر کے یاد کیے کُلیے دہرانے لگا۔ اُس کا چہرہ وقت سے کچھ پہلے ہی بھر بھر سا گیا تھا اور اُپر لے لبوں کے بالائی حصے پر روئیں سی اُبھر آئی تھیں۔

آج اُسے ایک اور شئے کا انتظار بھی تھا۔ اُس کے ابا نے نیا یونیفارم لانے کا وعدہ کیا تھا۔ ابا چاہتا تھا کہ بیٹا امتحان میں تازہ ذہن اور نئے لباس کے ساتھ بیٹھے۔

اِدھر بس ابھی تک نہ آئی تھی۔ جب تیز ٹھنڈی ہوا کے برفیلے جھونکے، جو اخروٹوں اور سیبوں کی زمین سے یخ بستگی ساتھ میں لے آئے تھے، اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے تو اُس نے کس کر مفلر اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور قریبی درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ مگر اُس کی نگاہیں بدستور تاریکی میں دو جگنوؤں کو تلاش کر رہی تھیں۔ شہر کے معتدل موسم کی وجہ سے پچھلے برسوں میں تو لوگ سردیوں میں سادہ قمیص پہن کر بھی باہر نکل آتے تھے مگر اس مرتبہ خنکی غیر معمولی تھی۔ رات کی تاریکی ہو یا دن کا اُجالا آسمان پر بادل چھائے رہتے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہتی۔

اُس نے کئی مرتبہ ارادہ باندھا کہ ٹیکسی یا رکشہ کر لے۔ مگر وہ بھی شہر کی سڑکوں پر سے اس طرح ناپید تھے جیسے میت کی کلائیوں سے کنگن۔

اُدھر کاشان ٹہلتے ٹہلتے تھک کر مونڈھے پر بیٹھ گیا اور سامنے لگے دیوار گیر کلاک کو گھورنے لگا۔ اُس میں یہ عادت راسخ ہو چکی تھی کہ جب تک اپنی پڑھائی سے مطمئن نہ ہوتا اُسے بمشکل ہی نیند آتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر جماعت میں اوّل آتا تھا۔ گو کہ کچھ عرصے سے اُس کے ابا کو اُسے سوال حل کرانے میں مشکل پیش آ رہی تھی مگر وہ جیسے تیسے درست نتیجے تک پہنچ ہی جاتا تھا۔ جو سوال بالکل ہی سمجھ میں نہ آتے، ابا اپنے دفتر لے جا کر ایک مہربان اکاؤنٹنٹ سے سمجھ آتا۔ اب کے ابا نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی جماعت میں وہ اسے ٹیوشن سنٹر میں داخل کروا دے گا۔ ویسے بھی وہ خود اپنی تعلیمی استعداد سے بڑھ کر کتنا سمجھ سکتا تھا۔ اُس نے اپنے باس کو اوور ٹائم پر بھی

آمادہ کرلیا تھا۔

اِدھر جب کافی دیر گزر گئی اور سڑک پر اکا دُکا گاڑیوں کے علاوہ کسی بس کے آنے کا امکان معدوم ہونے لگا تو وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر اپنے گھر کی جانب تیز تیز قدم اُٹھاتا پیدل چلنے لگا۔ چلنے کی وجہ سے اُسے اپنے جسم میں حرارت محسوس ہوئی تو اُس کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی۔ ساتھ میں وہ دونوں ہاتھوں کو بھی اس احتیاط سے ملتا جاتا تھا کہ بغل میں دبا یونیفارم کا ڈبہ نہ گر پڑے۔ گھر کو پیدل روانہ ہونے کے ارادے پر ایک مرتبہ تو وہ مسکرا بھی دیا لیکن پھر سنجیدہ ہوگیا۔ ابھی اُسے چلتے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مینہ برسنے لگا۔

وہ اپنی قسمت کو کوستا ایک بند دُکان کے سامنے چھجے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

اُدھر کاشان نڈھال ہو رہا تھا۔ اُس نے ابا کے انتظار میں اب تک کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ وہ بے معنی نظروں سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے کارنس پر اُس کی مرحوم ماں کی تصویر رکھی تھی جس میں چھوٹا سا کاشان ماں کی گود میں بیٹھا ہنس رہا تھا۔ ساتھ میں کاشان کی اپنی تازہ تصویر دھری تھی جس میں اسکول کا ہیڈ ماسٹر اوّل آنے پر اُس کے گلے میں میڈل ڈال رہا تھا۔ اُس کا ابا کہا کرتا تھا کہ وہ اُسے اتنا لائق بنائے گا کہ وہ اُس کے بڑے باس سے بھی بڑا افسر بنے گا۔ وہ تصور میں ابا کو اپنے متعلق خواب سُناتے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔

اِدھر جب مینہ، موسلا دھار بارش میں تبدیل ہوگیا، مٹی کیچڑ میں بدلنے لگی اور بارش کی دیوار اُس کا لباس بھگونے لگی تو اُس نے کسی گزرتی کار سے لفٹ لینے کا ارادہ کیا اور سڑک پر آ گیا۔ ابھی وہ سڑک پر آیا ہی تھا کہ رات کی تاریکی کو چیرتی دو روشنیاں اُس کی جانب بڑھیں۔ شائد وہ کوئی وین تھی۔

وین کے ڈرائیور نے سڑک کے اس ویران گوشے میں کھڑے تنہا شخص کو دیکھ کر گاڑی کی بتیاں بجھا دیں اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔

اُس نے وین کو آتا دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ وین کی کھڑکی سے اسٹریٹ لائٹ کی کٹی پھٹی روشنی میں دھات کی ایک بندوق برآمد ہوئی جس نے ایک شڈکاری بھری اور دو شعلے اُگل دیئے۔ اُس نے حیرت سے وین کو دیکھا اور اپنے بغل میں دبا یونیفارم کا ڈبہ

سڑک پر پھینک کرفٹ پاتھ پر خاموشی سے لیٹ گیا۔

وین ڈبے کو کچلتی کسی نامعلوم مقام کی جانب روانہ ہوگئی۔

اُدھر عین اُسی لمحے مونڈھے پر سوتا کاشان چونک کر اُٹھ بیٹھا اور رونے لگا۔

خبر تو ایک تھی مگر لوگ دو۔

پہلا شخص اخبار کا ایڈیٹر جس کے پاس انٹرنی رپورٹر جب یہ چار سطری خبر لایا ''پچھلی شب نامعلوم دہشت گردوں کی فائرنگ سے ایک بے گناہ شخص مارا گیا۔ ورثا کی تلاش میں ناکامی کے بعد لاش کو ویلفیئر والوں نے دفنا دیا۔ پولیس قتل کی تحقیقات کر رہی ہے۔ جلد مثبت نتائج آنے کی توقع ہے۔'' تو ایسی معمولی خبر لانے پر ایڈیٹر نے رپورٹر کو مزید محنت کرنے کی تلقین کی۔

دوسرا شخص کاشان ہے' جو آج بھی گیراج میں گاڑیوں کی مرمت کرتے ہوئے کبھی کبھار چونک کر دروازے کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔

اپنے حصّے کی روشنی

ننھا ساجد اپنے کھلی آستینوں والے کرتے کی کف سے اپنی ناک پونچھتے ہوئے مجھ سے پوچھتا ''چاچو! ننھی ایک دم کہاں سے آگئی؟ امی کہتی ہیں کہ اسے پریاں ہمارے گھر چھوڑ گئیں۔ ابو کہتے ہیں کہ ننھی کو فرشتے ہمارے گھر بھول گئے تھے۔ مگر چاچو ننھی تو بالکل نادو جیسی ہے۔ کیا نادو کو بھی پریاں ساتھ والے گھر میں چھوڑ گئی تھیں؟'' مجھے اس کے اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا اور میں اسے طریقے سے ٹال جاتا۔

اگر سب جگہ سے اسے ایک سا جواب ملتا تو شاید وہ مطمئن رہتا۔ لیکن جب کوئی اسے کہتا کہ ننھی کو پریاں چھوڑ گئیں، کوئی اس تحفے کے پیچھے جنات کا بتاتا اور کوئی کہتا کہ وہ ایک پرندے کے رنگین پر کی طرح ہوا پر تیرتی کھڑکی کے رستے گھر میں آگئی تو ننھا ساجد اور بھی زیادہ تذبذب کا شکار ہو جاتا۔

یہ سب سن کر وہ میرے پاس آجاتا۔ کافی کافی دیر تک اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے مجھے، قانون کی کتابوں میں گم، انہماک سے تکتا رہتا۔ پھر کچھ ہمت کر کے میرے گھٹنے پر اپنا ایک ننھا سا ہاتھ رکھ کر اور دوسرے ہاتھ سے میری ٹھوڑی کو چھیڑ کر التجائیہ انداز میں باتیں کرنے

لگتا۔ کچھ دیر گزرتی تو التجائیہ انداز کا تکلف چھوڑ کر میری گود میں اپنے ننھے ننھے پیروں سمیت چڑھ آتا۔ اس کے کرتے کے نچلے حصے پر اکثر کیچڑ کے نشان ہوتے لیکن مجھے اپنے کپڑے خراب ہونے سے کبھی گھبراہٹ نہ ہوتی، بلکہ اس کے نرم و نازک ہلکے ہلکے وجود کو اپنی گود میں بھر کر ایک عجب پدرانہ شفقت سی محسوس ہوتی اور بے اختیار اس کے بھرے بھرے سرخ گال چوم لینے کو جی کرتا۔

مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ میں ان کے گھر میں کرایہ دار ہوں۔ ان پانچ برسوں میں ننھے ساجد کے گھر والوں کے ساتھ میں اس طرح گھل مل گیا ہوں جیسے میں ان کے گھر ہی کا فرد ہوں۔ ننھے ساجد کے ابو کئی مرتبہ معمولی نوعیت کے مسائل پر میرا قانونی مشورہ لینے میرے کمرے میں آجاتے رہے ہیں۔ بھلے مانس آدمی ہیں۔ بجلی کے کھمبے پر فیوز بلب ہوئے ڈھکن گٹر ہو یا پھر گلی میں لٹکتی تاریں ہوں، وہ سرکار کی بے عملی پر کڑھ کر شائد کچھ زیادہ ہی شکوہ کر جاتے رہے ہیں۔

ننھے کو مجھ سے خاص انس ہے۔ میرے دل میں بھی اس کے لیے ایسے ہی جذبات ہیں جیسے کسی باپ کے دل میں بیٹے کے لیے ہوتے ہوں گے۔ طاہرہ کی زچگی کے دوران پیچیدگی کی وجہ سے وفات کے بعد سے میں دوسری شادی اور اولاد پیدا کرنے کے ارادے کو ویسے ہی دل سے نکال چکا ہوں۔ ایسے میں ننھا میرے اس خلا کو بہت اچھی طرح پُر کرتا۔ عدالت سے واپسی پر میں اکثر اس کے لیے کوئی نہ کوئی کھلونا، ٹافی یا بسکٹ وغیرہ لے آتا۔

ننھی بھی میرے سامنے ہی پیدا ہوئی۔ ننھا ساجد اکلوتا تھا۔ شاید حسد میں مبتلا ہو جاتا لیکن اسے تو جیسے ننھی سے عشق ہو گیا۔ ننھی پتہ نہیں کس پر گئی تھی۔ بہت چھوٹی، نرم و نازک اتنی کہ گود میں لیتے وقت ڈر لگے ---- سرخ رنگت ---- آنکھیں ہر وقت بند بند۔ جب ہنستی تو منہ سے پانی کے بلبلے نکلتے لیکن مٹھیاں بھنچی رہتیں ---- اور جب روتی ---- اور روتی بہت کم تھی، تو آنکھیں تو بھیگ ہی جاتیں لیکن ہونٹ مسکراتے رہتے۔ مٹھیاں تب بھی بھنچی ہی ہوتی تھیں۔

ننھا ساجد تو ننھی پر فدا ہو گیا تھا۔ ہر وقت اسے گود میں اٹھائے پھرتا۔ خود پاؤ بھر کا تھا۔ چھٹانک بھر کی ننھی کو گود میں جب بمشکل اٹھاتا تو جی سہم جاتا کہ کہیں گرا نہ دے۔ لیکن اس کی ضد کے آگے اس کے ماں باپ کی کچھ نہ چلتی۔ ننھی بھی استاد تھی۔ پلنگ پر پڑی رو رہی ہے۔ باپ گود

میں جھلا رہا ہے، ماں لوریاں دے رہی ہے لیکن صاحبزادی چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ ادھر ننھے نے گود میں اٹھا کر کان میں کوئی سرگوشی کر دی، ادھر ننھی کھلکھلاتی اس کی گود میں ہمکنے لگی۔

ننھی جب ذرا بڑی ہوئی تو ننھا ساجد ایک دن مجھے بہت اصرار کر کے اپنے ساتھ بازار لے گیا۔ میں رستہ بھر پوچھتا رہا کہ کس لیے جا رہے ہو لیکن وہ بس میری انگلی پکڑے مجھے کھینچتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ شاید ٹافیاں لینا چاہتا ہے لیکن ٹافیوں کی دکان بھی گزر گئی قلفی والے کا ٹھیلا اور میٹھے لچھوں کی ریڑھی بھی پیچھے رہ گئی تو آخرکار کھلونوں کی دکان کے سامنے جا ٹھہرا۔ جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور دکاندار کو ڈانٹ کے انداز میں کہنے لگا "یہ جو سامنے تین پہیوں والی سائیکل ہے نا! ہمیں پیک کر دو۔ جلدی کرو۔" دکاندار ہنس پڑا۔ میں نے اسے آنکھوں سے اشارہ کر دیا کہ بقایا پیسے پہنچا دوں گا۔ دکاندار نے سنجیدہ چہرہ بنا کر سائیکل ہمارے حوالے کر دی۔ بس پھر کیا تھا۔ ننھی کے لیے خریدی گئی سائیکل پر اسے بٹھا کر ننھا ساری ساری دوپہر صحن میں گھوں گھوں کی آوازیں نکالتا بھاگتا پھرتا اور میرے کمرے میں کھڑکی کے رستے ننھی کی ہنس ہنس کر چیخنے کی آوازیں آتی رہتیں۔

اسی دوران ننھے پر ایک نیا خبط سوار ہوا۔ کہیں سے سلمیٰ ستارے کے کام والا ایک دوپٹہ اٹھا لایا۔ اپنی ماں کی لپ اسٹک ننھی کے ہونٹوں پر بہت تشویشناک توجہ کے ساتھ لگاتا۔ ننھی بھی منہ اٹھائے آسمان کو دیکھتی رہتی۔ پھر تھوڑی سی لپ اسٹک ننھی کے گالوں پر تھوپ دیتا۔ میک اپ مکمل کر کے اور دوپٹہ اوڑھا کر تنقیدی نظروں سے، ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے، مختلف زاویوں سے ننھی کا جائزہ لیتا رہتا۔ اگر میک اپ پسند آ جاتا تو بھاگا بھاگا کمرے میں جاتا۔ تھوڑی دیر بعد برآمد ہوتا تو ہونٹوں کے اوپر کالے مارکر سے مونچھیں بنی ہوتیں گال پر ایک موٹا سا تل ہوتا اور سر پر پگڑی کی جگہ پرانا ہیٹ ہوتا۔ دُلہا محترم مکمل تیار حالت میں ہوتے۔ پھر دُلہا دلہن کا ناٹک شروع ہو جاتا۔ اسے بہت سمجھایا گیا کہ تم دونوں بہن بھائی ہو دلہا دلہن بننا کچھ زیادہ مناسب نہیں، مگر وہ اڑ جاتا۔ پھر وجہ پوچھتا۔ جب مطمئن نہ ہو پاتا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ تنگ آ کر اسے اس کی اس کی حالت پر چھوڑ دیا گیا۔

ننھی اب کچھ بڑی ہو رہی تھی۔ اُس نے ٹوٹی پھوٹی بولی میں ضد کرنا شروع کر دی تھی۔

جب کبھی ننھا اسے گھسیٹتا، گود میں اٹھاتا اور انگلی سے پکڑے چلاتا بمشکل میرے پاس لے آتا تو ننھی اپنے ہاتھ کو آگے کر کے اور آنکھیں بند کر کے ہنستی جاتی اور کہتی جاتی ''چیجی دو نا! دو نا چیجی !'' اور میں اس مقصد کے لیے دراز میں رکھی ٹافیوں میں سے دو تین ٹافیاں اس کی سرخی مائل گوری ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ اس پر وہ اس طرح خوش ہوتی جیسے اسے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ وہ پہلے ایک ٹافی ننھے کو دیتی جو ٹافی کاغذ میں سے نکال کر اس کے منہ میں ڈال دیتا۔ پھر دوسری ٹافی انتہائی فیاضی سے اسے پکڑا دیتی ''لو کھالو۔''

جب ان کے ابو گھر میں نہ ہوتے تو وہ دھما چوکڑی مچتی کہ خدا کی پناہ۔ چھپن چھپائی کا کھیل چلتا رہتا۔ ننھی صاحبہ کبھی پلنگ کے نیچے چھپ رہی ہیں تو کبھی نیم وا دروازے کے پیچھے۔ ننھا پراسرار خاموشی سے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ جب ڈھونڈ لیتا تو ایک دم ''چا'' کہتا سامنے آ جاتا۔ اس پر ننھی شور مچاتی، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بھاگتی جاتی اور کہتی جاتی ''یہ میں نہیں ہوں' یہ میں نہیں ہوں۔''

ٹی وی پر کرکٹ سیریز چل رہی تھی۔ ہر جگہ گلی میں بازاروں میں کرکٹ ہی کرکٹ تھی۔ ننھا کب کسی سے پیچھے رہنے والا تھا۔ ضد کر کے گیند بلا لے آیا۔ صحن چھوٹا سا تھا۔ ایک جگہ مونڈھا رکھ کر وکٹ بنائی جاتی۔ بیٹ اٹھا ننھی کو باؤلنگ پر لگا دیا جاتا۔ بیچاری بمشکل چل پاتی تھی' باؤلنگ خاک کراتی۔ لیکن ننھے نے تھوڑے کو غنیمت جانا اور اپنی بیٹنگ پریکٹس جاری رکھی۔

برسات کے دن تھے۔ میں اپنے بالائی منزل والے کمرے میں بیٹھا فائلوں میں سر کھپاتا رہتا۔ یہ گھر اندرون شہر میں قدیمی انداز کا تھا۔ کھڑکی میں سلاخیں لگی تھیں۔ اوپر لکڑی کا مغلئی انداز کا چھجا بارش کی ٹپ ٹپ سے گونجتا رہتا اور پانی نانک شاہی نما چھوٹی اینٹوں پر بہتا رہتا۔ سیوریج کہیں کہیں متعارف کرائی گئی تھی لیکن گٹر پانی سے اتنے بھر جاتے کہ گلی نہری بن جاتی۔ ایسے میں گزرنے کے لیے اینٹیں رکھ دی جاتیں جن پر راہ گیر سرکس کے مشاق بازی گر کی طرح بمشکل توازن قائم کرتے گزرتے جاتے۔ میں جب کام سے تھک جاتا تو اپنی میز کرسی سے اٹھ کر سامنے پڑی جالی دار آرام کرسی پر آن بیٹھتا اور سامنے مکڑی کے جالے میں گھرے سر شام جلنے والے اکلوتے زرد بلب کے گرد طواف کرتے پروانوں کو دیکھتا رہتا۔

ایک روز جب بارش زور شور سے ہو رہی تھی اور شہر کی سڑکیں پانی سے بھر گئی تھیں تو میں جلد ہی عدالت سے گھر لوٹ آیا۔ اس روز نہ جانے کیوں صبح ہی سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

میں گلی میں داخل ہوا تو گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی۔ میلے رنگوں اور سفید شلوار کرتوں اور دھوتیوں میں ملبوس لوگ سنجیدہ چہرے بنائے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ گھر کے قریب پہنچا تو رونے کی آوازیں آئیں۔ میں ٹھٹھک گیا۔ سوچا واپس لوٹ جاؤں لیکن پھر آگے بڑھا۔ مجھے دیکھ کر لوگوں نے رستہ بنا دیا۔ جب گھر کی چوکھٹ عبور کی تو سامنے برآمدے میں رکھی چارپائی پر نظر جا پڑی۔ بھولی بھولی ننھی سامنے بستر پر پڑی سو رہی تھی۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے---اور ہاں، مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ ویسے ہی جیسے بہت چھوٹی ہوتی بھینچتی تھی۔

ننھی کی ماں بال بکھیرے پچھاڑیں کھاتی تھی۔ پڑوسنیں اور رشتہ دار عورتیں روتے ہوئے اسے سنبھالتی تھیں لیکن وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر ان کے بازوؤں سے نکل نکل جاتی تھی۔

اندر کمروں میں اور باہر صحن میں لوگ کھڑے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ چوخانی تہبند باندھے ایک شخص دوسرے کو کہہ رہا تھا "ظالموں نے یہ کیا کر دیا۔ کم از کم گٹروں پر ڈھکن ہی ڈال دیئے ہوتے۔ جہاں کچھ ڈالے تھے وہ چوری ہو گئے۔ بیچاری معصوم بچی گیند لینے باہر نکلی تھی۔ گھر کے سامنے بے ڈھکن گٹر تھا۔ کیا معلوم تھا موت کھینچے لیے جا رہی ہے..."

اس کے بعد بارش کی بوندیں میرے تن وجود پر برستی رہیں اور میرے آنسوؤں میں شامل ہو کر بہتی رہیں۔

ننھا سا جداب میرے پاس بہت کم آتا ہے۔ ایک دم سے بڑا بڑا سا ہو گیا ہے---پختہ پختہ سا---جیسے ایک پانچ چھ سال کے بچے کو پختہ مرد کا چہرہ دے دیا گیا ہو۔ ہر ایک سے روٹھا روٹھا رہتا ہے۔ جب کوئی بلائے تو بات کرتا ہے ورنہ خاموش رہتا ہے۔ ضد کرنی چھوڑ دی ہے۔

وہ جب کبھی بہت موڈ میں ہو تو میری گود میں چڑھ آتا ہے اور پوچھتا ہے "چاچو! ننھی کہاں چلی گئی ہے اور کیوں چلی گئی ہے؟ میرا جی اس کے بغیر نہیں لگتا۔ ابو کہتے ہیں کہ جلدی واپس آجائے گی۔ چلو چل کے خود ہی لے آتے ہیں۔ ابو تو بس بہانے بناتے رہتے ہیں۔"

میں بھیگتی آنکھوں سے سوچتا رہتا ہوں کہ جب ننھا بڑا ہو گیا تو اسے اس سوال کا

جواب تو مل جائے گا جو وہ چھوٹے ہوتے پوچھتا تھا کہ ”ننھی کہاں سے آئی ہے؟“

لیکن اسے یہ جواب شائد کبھی نہ مل سکے کہ وہ کہاں چلی گئی۔

کیونکہ مجھے بھی تو آج تک طاہرہ کے کہاں چلے جانے کا جواب نہیں مل سکا۔

البتہ ننھی کے کیوں چلے جانے پر اس کے ابو کی یہ بات جو تب میرے دلاسا دینے پر انہوں نے کہی تھی شائد اس کے سوال کا جواب ہو سکے ”آج سمجھ میں آیا اس میں میرا بھی قصور تھا۔ دوسری طرف دیکھنے کی بجائے کاش کہ اپنے حصے کا ڈھکن میں نے خود ہی ڈال دیا ہوتا۔“

جنگل کہانی

قصہ گو نے کھنگار کر گلا صاف کیا اور بات شروع کی۔ ''وہ ایک ہرا بھرا جنگل تھا۔ سبزہ اتنے گہرے نم ہرے رنگ کا تھا کہ جلتی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا اور گھنا اتنا کہ سورج کی کرنیں خال خال ہی زمین کو چھو پاتیں۔ اکثر مقامات پر روشنی کو پودوں اور درختوں کی گتھی ہوئی شاخیں اور ٹہنیاں اوپر ہی روک لیتیں اور نیچے صرف ایک فرحت بخش ٹھنڈا پر اسرار اندھیرا رہ جاتا۔ پورا جنگل پستہ قامت درختوں اور پودوں کا سمندر تھا۔ جب تیز ہوا چلتی تو پودوں اور اونچی گھاس میں یوں لہریں اٹھتیں جیسے کسی وسیع جھیل میں شہاب ثاقب کے گرنے سے ارتعاش پیدا ہوتا ہو۔ کہیں کہیں پھولوں کے تختے یوں بہار دکھاتے جیسے سبز چادر پر رنگا رنگ سلمیٰ ستارے کا کام ہوا ہو۔ جہاں ایک طرف بڑے پھیلاؤ والا پیازی چھتری نما پھول جوبن دکھاتا وہیں دوسری جانب اودے پیلے چھوٹے چھوٹے خودرو پھول نومولودوں کی طرح کلکاریاں مارتے دکھائی دیتے۔ پھر ایک پھول تو گہرے سرخ رنگ کا ہوتا جیسے خون سے بھرا ہو تو ایک اور پھول انسانی شکل سے مشابہہ ہوتا اور ہلکی ہوا میں کبھی بند اور کبھی کھلتا ہوا جھومتا جاتا۔ پھل بھی طرح طرح کے تھے، رس بھرے بے بیج، رسیلے اور یا پھر بیجوں سے گتھے ہوئے لذیذ۔ کوئی شہد کی طرح شیریں تو کوئی لیموں کی طرح ترش، کوئی

گولائی مائل تو کوئی لمبوترا' کوئی نارنگی رنگ کا تو کوئی ست رنگا' کوئی مغز بھرا اخروٹی تو کوئی دودھ بھرا ناریل نما پھل، بھینی بھینی خوشبو چھوڑتا ہوا۔''

قصہ گو نے ذرا سا توقف کیا اور پھر اپنی بات جاری کی۔''یہ رنگ رنگ کے پھل پھول اور پودے کہاں سے آئے، تو یہ ایک دلچسپ قصہ ہے۔ چونکہ یہ علاقہ نہ زیادہ سرد تھا اور نہ ہی گرم، سو ہر موسم اور ہر خطے کا پرندہ سفر کے دوران کچھ مدت کے لیے یہاں بسیرا ضرور کرتا۔ جب وہ پرندے پرواز کرتے یہاں آتے تو ان کے بالوں، پروں، چونچوں اور جسموں کے ساتھ ہر طرح اور ہر علاقے کے بیج اور افزائش حیات سے متعلق ذرات چپکے ہوتے جو وہ نادانستگی میں یہیں چھوڑ کر روانہ ہو جاتے۔ انہی ذرات اور بیجوں سے یہ ہرا بھرا جنگل اُگ آیا تھا۔ جنگل کے عین وسط میں شفاف پانی کی ایک اکلوتی ندی تھی۔ اس کا پانی سورج کی کرنوں میں ہیرے کی طرح دمکتا تھا اور چلچلاتی دھوپ میں اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس جھیل کی تہ کافی گہرائی میں تھی مگر پانی کے شفاف ہونے کی وجہ سے یوں دکھائی دیتی جیسے ابھی ہاتھ ڈالا اور چھو لیا۔ تہہ میں رنگا رنگ پتھر تھے۔ کوئی ولائتی مرغی کے انڈے کی جسامت، شکل اور رنگ کا تو کوئی کاسنی رنگ کا' کوئی کائی زدہ تو کوئی شیشے کی طرح شفاف۔ چند ایک نوکیلے پتھر تو اتنے گہرے نیلے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ انہیں چھیڑا گیا تو یہ پانی میں اپنا رنگ چھوڑ دیں گے۔ اور ہاں پرندے بھی طرح طرح کے تھے۔ کہیں مور کی دم والا قرمزی پنچھی لپکتا ہوتا تو کہیں کاسنی چڑیا پھدکتی ہوتی۔ کسی شاخ پر چاندی میں تراشا پرندہ آنکھیں پٹ پٹاتا تو کہیں ہوا میں محوِ خرام کیسری کلغی والے طلائی پرندے پر نظر پڑتے ہی آنکھیں اس پر سورج کی کرنوں کی جھلملاہٹ کے باعث چندھیا جاتیں۔ ہاں ایک سیاہ دھبوں والا سہ رنگا دھاری دار پرندہ بھی تھا۔ یہ پرندے کبھی آپس میں الجھ بھی پڑتے مگر رات ایک ماں کی طرح سب جھگڑوں اور الجھنوں کو اپنی گود میں سلا کر ایک نئی صبح کا بھیس بدل لیتی۔ تمام جنگلوں کا یہی دستور ہے کہ پرندوں کی دوستیاں اور دشمنیاں فطری بنیادوں پر تو ہو سکتی ہیں مگر ذاتی سطح پر نہیں ہوتیں۔''

''اور یہ قصہ بھی ایک ہی پرندے کے باعث وجود میں آیا۔ ایک سہ پہر جب سورج پگھل پگھل ندی کا پانی ہم رنگ کر رہا تھا تو انجانی منزلوں سے نہ جانے کتنی مسافتیں طے کرنے

کے بعد ایک بدنما اور بدبودار پرندے نے ندی کنارے بسیرا کیا۔ اگلی صبح وہ وہاں سے پرواز تو کر گیا مگر ایک بیج ندی کے بطن میں چھوڑ گیا۔ بیج اپنے وجود میں مست، تیرتا ڈوبتا ندی کنارے جا لگا۔ چند روز میں اس نے ندی کنارے اپنے پنجے گاڑ دیے۔ کافی عرصہ وہ ایک ننھے پودے کی ڈنٹھل کی طرح وہاں جما اپنی جڑیں مضبوط کرتا رہا۔ آخر وہ اس مقام پر بھرپور طریقے سے جم گیا۔ ندی بھی اپنے پانی سے اس کی پرورش کرتی رہی۔ اب وہ ننھے پودے کی جگہ ایک مختصر بوٹے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ بہت سموں بعد جب ایک شام سورج نے پہلے ایک آنکھ بند کی اور شام کا سرمئی غبار ہر سو پھیل گیا' پھر دوسری آنکھ بند کی تو شک کا ایک شعلہ اس میں جلا، بجھا اور پھر بھڑک کر بجھ گیا۔ ہر سو سیاہی چھا گئی۔''

''اگلی صبح جب پرندے دانا دنکا ڈھونڈنے اپنے اپنے گھونسلوں اور اپنی اپنی کھوہ سے نکلے اور ندی کنارے پانی پینے پہنچے تو بھونچکا رہ گئے۔ چشم فلک نے بھی ایک عجیب منظر دیکھا۔ اردگرد کی نباتات بھی سہم کر رہ گئی۔ یہ منظر ان کے لیے نیا بھی تھا اور عجیب بھی۔ وہ جگہ جہاں رات کو بیج والے پودے کو جما ہوا چھوڑا گیا تھا، وہاں اب ایک تن آور درخت کھڑا تھا۔ اس جیسا توانا اور بلند و بالا درخت اس پورے جنگل میں نہ تھا۔ وہ جنگل تو تھا ہی بوٹے قد والے درختوں اور پودوں کا۔ ایک تو درخت کے قد کاٹھ، دوسرے اس کے حجم نے سب پر رعب ڈال دیا۔ مگر حیرت کا دھچکا سب کے لیے یہ تھا کہ وہ خوبصورت الھڑ ندی خشک پڑی تھی۔ وہ پودا جس کی پرورش ندی کرتی رہی تھی اس نے نظریہء ضرورت کے تحت ایک ہی رات میں ندی کا سارا پانی چوس لیا تھا۔ وہاں اب ندی کی جگہ ایک جوہڑ تھا۔ ہیرے کی طرح چمکتے اور موتیوں کی طرح دمکتے مرغی کے انڈوں کی جسامت کے پتھر اور دیگر رنگا رنگ سنگریزے اب کیچڑ میں لتھڑے، گارے میں دھنسے نظر آتے تھے۔ اور اب وہ درخت سینہ تانے اس ندی کے کنارے غرور سے کھڑا ایک چشمی نظر نیچی کیے نخوت سے سارے نباتات اور پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ سب اس کے رعب سے سہم کر رہ گئے مبادا وہ ندی کے بعد کسی اور معصوم کو نقصان پہنچا دے مگر وہ بظاہر توانا درخت اندر سے ٹھوس نہ تھا بلکہ مائع و سیال مادے سے بھرا ایک ناتواں وجود تھا۔ اس حقیقت کو وہ جان بھی کیسے سکتے تھے کہ ان کی نظر صرف ظاہر پر تھی۔''

یہاں پہنچ کر قصہ گو نے ایک بڑا گھونٹ پانی کا بھرا، لمبی سانس لی اور بات کی ڈوری کا سرا پھر سے پکڑ لیا۔ ''قصہ مختصر یہ کہ شروع میں تو وہ درخت ایک عمودی تنے کی صورت میں تھا۔ کچھ عرصے بعد اس پر چند ایک کونپلیں پھوٹیں اور دو چار تنے اس کی کوکھ سے سر نکالنے لگے۔ اسی دوران بیرونی دنیا سے ہجرت کر کے آنے والے پرندے پانی کی کمیابی کے باعث حالتِ نقاہت میں وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ لیکن قیامت تو وہاں کے اصل باسی نباتات اور پرندوں پر ٹوٹی جو پانی کی قلت کے باعث جاں بلب ہونے لگے۔ ان حالات میں غنیمت تو وہ پانی تھا جو سطحِ زمین سے زیادہ گہرائی میں نہ تھا۔ اس پانی سے پودے تو اپنی بقاء کا انتظام کرنے لگے مگر پرندوں کو ان پودوں کے پتوں کو چوس چوس کر گزارا کرنا پڑ رہا تھا۔ اب زیادہ مشکل دَور گھاس اور جڑی بوٹیوں پر تھا جن کی جڑیں زیادہ گہری نہ تھیں اور ندی کی قربت کے باعث وہ نمی جو ان کی جڑوں کو میسر رہتی تھی، مفقود ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ نیم نم زمین کچھ ندی کے سوکھنے اور کچھ بڑے درخت کے زیرِ زمین پانی کو آہستہ آہستہ چوسنے کے سبب خشک ہونے لگی۔ گھاس اور جڑی بوٹیاں مرجھانے لگیں۔ پہلے بھورا رنگ غالب آنے لگا اور بالآخر ہر طرف خاکستری رنگ پھیل گیا۔ اب بوٹیاں اپنے وجود میں سمٹنا شروع ہو گئیں۔ سمٹتے سمٹتے ان کا پھیلا ہوا وجود ایک مرجھائے ہوئے سخت اور خشک ٹہنی نما ریگستانی وجود میں تبدیل ہونے لگا۔ کونپلیں مرجھا کر جھڑنے لگیں۔ جب شروع میں چند ایک بوٹے مرجھا کر جل گئے اور ٹوٹ پھوٹ کر ہلکی تیز ہوا کے دوش پر اردگرد بکھرنے لگے تو ہر سو موت کی بو پھیل گئی۔ ایک آگ تھی جو ہر سو زندگی کو جلا کر خاکستر کر رہی تھی۔ طبل فنا بج چکا تھا۔ اس دوران بارش بھی نہ ہوئی کہ سیرابی کا کوئی سلسلہ ہوتا۔ پانی تو دور دور تک تھا ہی نہیں۔ سو کہاں سے بادل بنتے اور گرجتے اور برستے۔ کچھ ہی عرصے میں وہاں جنگل کی بجائے جنگل کا کھنڈر دکھائی دینے لگا۔ خشک درختوں کی مردہ ٹہنیاں، جھاڑ جھنکار اور مرے ہوئے نیم مردہ پرندوں کے پنجر جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ تمام جگہ قریباً برابر ہو چکی تھی۔ اس سارے قبرستان میں کوئی تعویزِ قبر تک نہ رہا تھا۔ بس ایک علم درمیان میں لہرا رہا تھا اور وہ تھا اس عظیم الشان درخت کا نخوت بھرا علم۔''

میں پورے انہماک سے یہ قصہ سن رہا تھا۔ ''اسی دوران درخت کی جڑیں جو ہلکی رفتار سے تھوڑا بہت زمین کا پانی پی رہی تھیں تیزی سے زیرِ زمین نمی کو چوسنے لگیں۔ نظریہ ضرورت کے

تحت اور اپنی بقاء کے لیے درخت نے اب تک جو پانی چوس لیا تھا اس سے درخت کا گھیراؤ اور بھی پھیل گیا تھا اور اس کے قد کاٹھ میں اس حد تک اضافہ ہو گیا تھا کہ اس جثے اور اونچائی کا درخت پورے علاقے میں اس سے پہلے نہ دیکھا گیا تھا اور نہ ایسے کسی درخت کا ذکر سنا گیا تھا۔ وقت کے پھیر میں ایک روز اس جنگل کے اوپر سے ایک گِدھ کا گزر ہوا۔ اس نے بلندی ہی سے ماندہ پرندوں کو پھڑ پھڑاتے اور تڑپتے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی گِدھوں کو مسرت آمیز انداز میں دعوتِ طعام دی۔ پورے گروہ نے نیچے جنگل میں یلغار کر دی اور خوشی سے چیخیں مارتے ہوئے، جاں بلب پرندوں کے مرنے کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی کوئی پرندہ لقمہ اجل بنتا گِدھ اس پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے اور وہ ہاہا کار مچتی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ آہستہ آہستہ سب پرندوں نے دم توڑ دیا۔ گِدھوں نے سیر ہو کر ان لاغر پرندوں کا بچا کھچا گوشت کھایا اور وہاں سے پرواز کر گئے۔ درخت یہ سب دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس میں 'درختیت' جاگتی تو تھی مگر زمینی حقائق کے سامنے دم توڑ جاتی۔ وہ بظاہر طاقتور تھا سو بازی مات کرتا آیا تھا۔ اب اس پر کبھی کبھار وہاں سے گزرتی دیو ہیکل چیلیں بسیرا کرنے لگیں۔ لمبے لمبے پنکھ نما پروں والی اور دور کے دیسوں سے آنے والی چیلوں کے جسم کراہت آمیز رگوں کے جال میں بندھے ہوتے اور ان سے ایسی بدبُو اٹھتی تھی کہ وہ جگہ جہاں کبھی پھلوں پھولوں کی خوشبو سے عطر بیز ہوا بہتی تھی، وہاں بدبو کے بھبکے یوں اٹھنے لگے جیسے کسی مردے کا پیٹ پھٹ جانے کے بعد اس کی گلی سڑی آنتوں اور غلاظت کی ہمک اٹھتی ہو اور نتھنے جلاتی ہو۔''

''پھر ایک دن درخت پر یہ اندوہناک انکشاف ہوا کہ اس کی جڑیں جہاں تک پہنچ سکتی تھیں وہاں تک پانی پی چکی تھیں۔ نیچے، بہت نیچے تو شاید پانی تھا مگر وہ اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ طبلِ فنا ایک بار پھر بجنا شروع ہوا۔ چرند و پرند میں خاص حس ہوتی ہے جو موت محسوس کر لیتی ہے اور مردے کی بو قبل از وقت سونگھ لیتی ہے' چنانچہ اسی بو کو سونگھ کر آخری چند چیلوں نے بھی زمینی حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نظریہ ضرورت کے تحت اپنا ٹھکانا چھوڑا۔''

''قصہ یوں ہے کہ درخت اب تک تو سلامت تھا۔ اس کا گھیراؤ بھی برقرار تھا قد کاٹھ بھی قائم تھا مگر اس کی جڑیں خوراک کے معدوم ہونے کے باعث کمزور پڑتی جا رہی تھیں۔ اس کی

زمین میں پیوستگی اب اس مضبوطی سے قائم نہ رہی تھی اور اس کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ چند ایک جڑیں تو سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گئی تھیں اور چند ایک کے سوکھنے کا عمل ایک سرے سے یوں شروع ہو گیا تھا جیسے کسی حادثے کے بعد انسانی انگوٹھے سے شروع ہونے والی سیاہی ساری ٹانگ میں آہستہ آہستہ سرائت کرتی جا رہی ہو اور بعدازاں اسے کاٹنا پڑ جائے۔ پھر ایک روز درخت دھڑام سے نیچے آ گرا۔ اس میں جو کچھ سیال موجود تھا وہ بہ نکلا اور قریبی نشیبی علاقہ اس سیال سے بھر گیا۔ کچھ ہی عرصے میں درخت گل کر خاک میں مل کر خاک ہوا۔ ہاں اس کا ایک کمزور سا ڈھانچہ ضرور آئندہ آہستہ آہستہ گلنے کے لیے رہ گیا۔"

"پھر ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ نشیب میں جمع مائع میں سے بخارات اٹھے۔ اوپر کہیں بادل بنے اور ایسا زور کا مینہ برسا کہ ہر سو جل تھل ہو گیا۔ مردہ زمین میں پھر سے جان پڑی۔ چند ایک مقامات پر پھر سے کونپلیں پھوٹیں۔ سبزے نے پھر جھلک دکھائی۔ اور آہستہ آہستہ ایک نیا جنگل عدم سے وجود میں آنے لگا۔ ماہرین نباتات بھی یہی بتاتے ہیں کہ غاصب درخت کو تا دیر موج کرنے کا موقع نہیں ملتا۔"

قصہ گو نے اتنا کہا اور کپڑے جھاڑتا اور آنکھیں پونچھتا اٹھ کھڑا ہوا۔

میں بھی اب تک جنگل کہانی سنتے تھک چکا تھا۔

پھر ایک آواز سنائی دی:

"اب یہ کہانی میں اپنی اولاد کو سناؤں گا تاکہ وہ اپنی اولاد کو سنائے اور یہ جنگل کہانی تب تک سینہ بہ سینہ نسل در نسل سفر کرتی رہے جب تک انسان میں انسانیت موجود ہے یا پھر تاوقتیکہ یہ کہانی اپنے آپ کو دہرانا نہ چھوڑ دے۔"

میرا دوست سیم

وہ بہار کے دن تھے۔

بند دفتر میں لیپ کی زرد روشنی کے نیچے فائلیں پڑھ پڑھ کر میری آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔

میں نے عینک اتار کر میز پر رکھی اور ایک انگڑائی لے کر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبایا تو سامنے چلتا ٹیبل فین بند ہو گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

پھر میں نے اٹھ کر کمرے کی واحد کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ سہ پہر کی خوشگوار ہوا کمرے میں بھر آئی۔ ساتھ میں نکھری تازہ روشنی بھی لے آئی۔

میرا دفتر سرسبز درختوں میں گھری شہر کی مرکزی شاہراہ مال روڈ پر واقع وکٹورین طرز تعمیر کی قدیم عمارت کی تیسری منزل پر ہے۔

نیچے کوئی جلوس جا رہا تھا۔ اس شاہراہ پر اکثر جلوس نکلتے ہی رہتے ہیں۔ میں دلچسپی سے جلوس کو دیکھنے لگا۔

نیچے لگتے نعروں کی دھیمی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

'''گورے گورے بائے بائے۔ گورے گورے بائے بائے'۔ گوروں کا جو یار ہے غدار ہے غدار ہے'''

مجھے سیم اس طرح یاد آ گیا جیسے بازار سے گزرتے ہوئے کسی ریڈیو پر چلتا کوئی پرانا فلمی گانا سن کر اپنی جوانی یاد آ جائے۔

وہ چھٹی کا ایک دن تھا۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ اپنے پرانے کاغذات اور سامان کو ترتیب دونگا۔ بہت سے مسودے مدتوں سے توجہ سے محروم الماریوں میں ٹھنسے پڑے تھے۔ میرا پروگرام تھا کہ ان کو جھاڑ پھونک کر فائلوں میں لگاؤ نگا۔ غرضیکہ اپنی برسوں کی بے ترتیبی کو ترتیب دینے کا ارادہ تھا۔

ابھی میں نے الماری کا پٹ کھولا کر کاغذوں کا پہلا پلندہ نکالا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

دروازہ کھولا تو سامنے خشخشی داڑھی والا شلوار قمیض میں ملبوس کوئی پٹھان شخص کھڑا تھا۔ کچھ دیر تو وہ مجھے آنکھیں بھینچ کر دیکھتا رہا پھر استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''عرفان!''

''جی''

''میرا مطلب ہے۔ کیا آپ عرفان ہی ہیں؟'' زبان اور لہجہ خالص امریکی تھا۔ میں تذبذب اور گومگو کی کیفیت میں بے ساختہ بول پڑا۔

''جی ہاں۔ مگر آپ کا تعارف؟'' میں نے انگریزی میں پوچھا۔ گومگو کی کیفیت ہنوز برقرار تھی۔

''سیم۔ تمہارا جگر سیم'' اس کے لہجے میں گرمجوشی نمایاں تھی۔

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''او ہ سیم۔''

پھر میں انگریزی میں بولتا چلا گیا۔ ''او ہ سیم۔ یہ تم ہو۔ سیم دی کا سانووا۔ کیا شاندار

سرپرائز دیا ہے تم نے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔سیم یہاں پاکستان میں' لاہور میں' ماڈل ٹاؤن میں' اور میرے گھر میں۔''

مجھے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا۔خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات میری زبان کو گنگ کر رہے تھے۔

ہم بے ساختہ بغلگیر ہو گئے۔

میں اس کی کمر کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''چلو بیٹھو آرام سے۔جلدی سے بتاؤ جوس پیو گئے یا چائے۔''

''دودھ پتی'' وہ انگریزی لہجے کو اردو کا تڑکہ لگاتے ہوئے خالص پاکستانی انداز میں بولا۔

دودھ پتی کے مگ ہاتھ میں پکڑے ہم دونوں صوفے پر بیٹھے تھے۔وہ بہت بدل گیا تھا۔شلوار قمیض پہنے بالکل پٹھان دکھتا تھا اور پھر اس نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔گردش ماہ وسال نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔وہ کچھ فربہ ہو گیا تھا۔چہرے پر خشخشی داڑھی اور آنکھوں میں گہری سنجیدگی سے وہ ایک سیاح سے زیادہ پروفیسر یا دانشور لگتا تھا۔آنکھوں میں البتہ لڑکپن کی وہ شرارت کبھی کبھی اپنی چمک کھا کر گم ہو جاتی جو اس کی جوانی کا خاصہ تھی۔پیروں میں اس نے بھاری پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔اور ہاتھوں میں سفری بیگ تھا جسے اب میں اٹھا کر تپائی پر رکھ چکا تھا۔

کافی دیر سکوت رہا۔وہ دیکھ تو مجھے رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کسی گہری سوچ کے سائے تھے۔مجھے دیکھتے دیکھتے اس نے کمرے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔اس کی نظر ایک تصویر پر رک گئی۔

''میرے بیوی بچے ہیں۔''

اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

''چند دن کے لیے اپنے نانا نانی کے گھر گئے ہیں۔''

پھر وہ آہستہ سے اٹھا اور ٹہلتے ہوئے کمرے کو دیکھنے لگا۔کمرے میں آویزاں ہر پینٹنگ کے سامنے کچھ دیر ٹھہر جاتا،اسے غور سے دیکھتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔

مجھے یادوں کا ایک خوشگوار جھونکا اپنے سراپے پر سے بہتا ہوا محسوس ہوا۔ میں کئی برس پیچھے چلا گیا۔

ہم دونوں ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔ ہم کسی بھی پینٹنگ کو سامنے رکھ لیتے یا اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور اس پر تبصرے شروع کر دیتے۔ اس کی مختلف تشریحات کرتے جاتے اور مصور کی انہی کیفیات پر تبصرہ جاری رہتا جن سے وہ پینٹنگ بناتے ہوئے گزرا ہوگا۔ وہ دور کی کوڑی لاتے کہ خود بیچارے مصور کے گمان میں بھی تصویر کا وہ رخ نہ ہوتا ہوگا۔ کبھی روشنی کے استعمال اور کبھی مختلف زاویوں، کبھی رنگوں کے امتزاج اور کبھی اسٹروک کے انداز پر بحث کرتے۔ جو جتنی انوکھی بات کرتا اور بغیر دہرائے تبصرہ جاری رکھ پاتا وہ جیت جاتا اور دوسرا اسے شرط کے مطابق کافی یا بیئر پلاتا۔

''تم نے اپنے پاکستان آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔ امریکہ سے واپسی کے بعد میں نے تمہارے ایڈریس پر رابطے کی بہت کوشش کی مگر ہر مرتبہ یہی پتہ لگتا تھا کہ تم نے گھر بدل لیا ہے۔ کچھ شرم نہیں آئی اپنے پرانے روم میٹ، اوپر سے دوست سے اور وہ بھی جگری دوست سے رابطہ توڑ کر۔''

وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

''میں کہا کرتا تھا نا کہ میں صحرائی ٹیلہ ہوں' ہوا جسے ادھر ادھر اٹھا کر رکھتی رہتی ہے۔ پانی کے دوش پر بہتا تنکا ہوں لہریں جسے مختلف ساحلوں اور جزیروں کی سیر کراتی رہتی ہیں۔ تو عرفان میں نے واقعی خانہ بدوشی اختیار کر لی ہے۔''

''مگر وہ تمہاری ڈگری اور پھر ساتھ میں اچھی فرم میں نوکری کے خواب' وہ سب کیا ہوئے؟''

وہ کسی گہری سوچ میں کھو گیا اور پھر فلسفیانہ انداز میں بولا

''نوکری کی تھی۔ بہت پیسہ کمایا۔ پھر ایک روز سمجھ میں آیا کہ یہ سب فریب ہے۔ اشیاء اکٹھی کرنے کی خواہش انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ اچھی کار' سپورٹس کار رکھی۔ اچھا گھر' لگژری اپارٹمنٹس میں رہا' وہ والے جن کا اپنا ساحل سمندر ہوتا ہے۔ اچھی عورت' خوبصورت اور ذہین

عورتوں کے ساتھ رہا۔ مگر دل کو قرار نہیں آیا۔ چیزیں اکٹھی کرتا رہا اور چیزیں مجھے بکھیرتی رہیں۔ پھر ایک دن تھک گیا۔ سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔''

''کیا سمجھے؟''

''یہ کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ چیزوں کے لمس میں سکون نہیں۔ اور پھر کام کے اوقات اتنے سخت تھے کہ پانچ برس گدھے کی طرح کام کرنے کے بعد ایک روز اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں بیٹھا تھا کہ خیال آیا کہ بہترین چیزیں اکٹھی تو کر لیں مگر ان سے محظوظ ہونے کا وقت میرے پاس نہیں تھا۔ اپنے لیے وقت نہیں تھا۔''

''پھر کیا کیا؟''

''مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں اپنے آپ سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ بلکہ اگر الفاظ کا درست انتخاب کرو تو اس طرح کہہ سکتے ہو کہ میں کبھی اپنے قریب رہا ہی نہیں تھا کہ دور ہوتا۔ میں اپنے آپ کو سمجھنا چاہتا تھا۔''

''اپنے آپ کو سمجھنا؟'' میں نے چائے کا مگ رکھتے ہوئے ادھورا سوال پوچھا۔ ''بڑی مشکل سی باتیں کرنے لگے ہو۔''

''ہاں لارڈ بدھا نے سجھائی ہیں۔''

''لارڈ بدھا؟''

''ہاں لارڈ بدھا۔ وہ انسانیت کا عظیم نجات دہندہ۔ آفاقی سچائیوں کا علمبردار۔ وہ کامل راہبر۔''

''بدھ ہو گئے ہو؟''

''پیدا ہی بدھ ہوا تھا۔ بہت دیر سے دریافت کیا۔''

''پھر؟''

''پھر نکل پڑا' چیزیں اکٹھی کرنے۔''

''مگر تم تو اس کے خلاف ہو؟''

''یہ ان سے مختلف چیزیں تھیں۔ اب میں انسان اکٹھے کرتا ہوں۔ یادیں اور انوکھے

لمحات اکٹھے کرتا ہوں۔اوران کا اپنے دل میں انبار لگا تا جا رہا ہوں۔''

میری توجہ کچھ دیر کے لیے گفتگو سے ہٹ گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔

سامنے باغیچے پر ایک خوبصورت اور آنکھیں چندھیا دینے والی دھوپ اتری ہوئی تھی۔ ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔اس لیے اب فضا نکھری نکھری تھی اور ہوا میں بھی تازگی تھی۔تازہ ہوا کمرے میں باغیچے میں لگے پھولوں اور نم سبزے کی مہک بھی ساتھ میں لے آئی۔

''کتنی خوبصورت دھوپ ہے۔'' وہ کھوئے انداز میں بولا۔

''ہاں''۔

''بالکل جنت کی دھوپ۔''

میں خاموش رہا۔

''چلو باہر چل کر بینچ پر بیٹھتے ہیں۔پیڑ کے نیچے۔''

ہم کمرے سے اٹھ کر وارنڈے سے ہوتے ہوئے باہر باغیچے میں آگئے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ،کوؤں کا شور اور پرندوں کی بولیاں فضا میں مسرت آمیز نغمگی کا راگ بکھیر رہی تھیں۔

''قدرت کی گود میں بیٹھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔یہ ہمارا حصہ ہیں اور ہم ان کا۔دیواروں نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔'' وہ ایک معصوم بچے کی سی خوشی سے مچل اٹھا تھا۔

ہم کچھ دیر اردگرد کے ماحول میں کھوئے رہے۔

سامنے نل تو بند تھا مگر اس میں سے قطرہ قطرہ پانی نیچے پڑے پیالے میں ٹپک رہا تھا۔ پیالہ لبریز تھا۔ایک چڑیا بہت دیر سے اس کے قریب بیٹھی تھی۔گھاس پر پھدکتی پھدکتی وہ پیالے کے قریب آئی اور اس کے کنارے پر آن بیٹھی۔ پانی کا موٹا سا قطرہ پٹاخ سے پیالے میں گرا۔چھینٹیں اڑیں اور چڑیا گھبرا کر پر پھڑ پھڑاتی وہاں سے اڑ گئی۔ہم دونوں اسے ہی دیکھ رہے تھے۔بے اختیار ہنس پڑے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔برسوں کی دوری سے پیدا ہونے والا ایک ہلکا سا تکلف پر پھڑ پھڑاتا اڑ گیا۔

اب میں اس سے کوئی ذاتی سوال کر سکتا تھا۔

''سیم میں نے شمل کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ اور پھر تمہارے گرینڈ پا۔ اپنی فیملی کا سناؤ۔''

اس کی آنکھوں میں دھند سی چھا گئی۔

جتنی تیزی سے چھائی تھی اتنی ہی تیزی سے چھٹ بھی گئی۔

''شمل کو تو تبھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ شادی چاہتی تھی۔ اور میں ان بندھنوں کے خلاف ہوں۔ بھلا ایک مرد اور عورت کیوں دنیا کو دکھانے کے لیے ایک دکھاوے کا بندھن باندھیں۔ آپس کا تعلق اتنا ذاتی ہوتا ہے کہ اس کو شوپیس کی طرح معاشرے کے سامنے پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ ذاتی معاملہ ہے ذاتی رہنے دو۔ اس پر سماجی ملمع سازی کرنے کا کیا فائدہ۔ ہاں تمہارا معاشرہ اور مذہب تمہیں اجتماعی سوچ سوچنے پر مجبور کرتا ہے جبکہ میں آزاد انفرادی سوچ کا قائل ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد وہ دوبارہ بولا ''اور جہاں تک گرینڈ پا کا تعلق ہے تو وہ بھی تب ہی فوت ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر مرنے کے بعد بھی ایک شاہانہ تمکنت تھی، بہت شانتی تھی۔''

''ہاں یار بہت شاندار شخصیت تھی ان کی۔ تمہیں اکثر ملنے آیا کرتے تھے۔''

''میرے بے دید باپ کے بعد وہی تو میری زندگی تھے۔''

''جہاں رشتوں کی بات آتی ہے تو تم امریکی بھی کافی جذباتی ہو جاتے ہو۔''

''خدا کا واسطہ ہے۔ جذبوں اور انسانوں کو سرحدوں میں تو قید نہ کرو۔''

''ہر ایک کا ذاتی تشخص ہے۔ اور پھر میں امریکی تو نہیں، دنیا کا باسی ہوں۔ اس کُرے پر بسنے والے اربوں انسانوں میں سے ایک۔ ریگستان میں ریت کا ایک ذرہ۔ میں سرحدوں کے خلاف ہوں۔ یہ سرحدیں جو انسان کو نفرت سکھاتی ہیں۔''

وہ پھر سے بولا ''تم نے گرینڈ پا کا پوچھا تھا۔ ان کے بعد میں جذباتی خلفشار کا شکار ہو گیا تھا۔ نفسیاتی معالجوں سے باقاعدہ علاج کرواتا رہا۔''

''اب ٹھیک ہو؟''

''ہاں۔ مگر ڈپریشن کا دورہ سا پڑتا ہے۔ بہت خوف آتا ہے۔''

''پھر کیا کرتے ہو؟''

''پہلے نیند نہیں آتی تھی۔اب آ جاتی ہے۔ بہت گہری نیند۔ رات بھر، آدھے دن تک سوتا رہتا ہوں۔ پھر جب اٹھتا ہوں تو بہت تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں۔ منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے۔ سر بھی درد سے پھٹا جاتا ہے۔ اس لیے بازاروں میں اور سڑکوں پر بے مقصد نکل جاتا ہوں۔ مگر اب جب سے دنیا کی آوارگی اختیار کی ہے تو دل کو حدت آمیز سکون سا مل گیا ہے۔''

''کتنا پھرے ہو؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''کئی برس ہو گئے ہیں لوگوں اور یادوں کو اکٹھا کرتے۔ میرے بالوں میں اب بھی مصر کے ریگ زاروں کی ریت پھنسی ہے۔ پھر جب بھی میرا جی چاہتا ہے تو گہرے سانس لیتا ہوں اور افریقہ کے گھنے جنگلوں کی وحشی تازہ ہوا اپنے اندر بھر لیتا ہوں۔ نیپال کے پہاڑوں پر چڑھتے وقت جو مٹی میرے ناخنوں میں پھنسی تھی وہ آج بھی ویسی ہی ہے۔ ملایا اور اس کے ساحلوں سے ٹکراتی موجوں کی نم مہک تم آج بھی میرے پسینے میں سونگھ سکتے ہو۔ ہندوستان کے بازاروں میں بکھرے رنگ، اگر تم چاہو تو اسی وقت میری آنکھوں میں دیکھ سکتے ہو۔ میں آزاد دنیا کا باسی ہوں اور اس دنیا میں کوئی سرحدیں نہیں۔''

''پاکستان آنا کیوں ہوا؟''

''لارڈ بدھا کے قدموں پر چلتا آیا ہوں۔ تمہارے پہاڑوں کی تعریف سنی تھی۔ اور تخت بھائی کے کھنڈرات میں کئی راتیں گزار آیا ہوں۔''

''یعنی کافی دنوں سے یہاں پر ہو۔''

''ہاں کافی دنوں سے۔''

''کیسا لگا پاکستان؟''

''اب تو دنیا کے سب شہر سب انسانوں کی طرح ایک سے لگتے ہیں۔ کوئی بھی شے نئی نہیں لگی۔ کوئی واقعہ چونکاتا نہیں۔ ویسے بھی زندگی میں چلتے چلتے یونہی تمہاری ملاقات اتفاقات سے ہو ہی جاتی ہے۔ بس نفرت کچھ زیادہ ہے اس خطے میں۔ ہر شخص دوسرے مذہب اور قومیت سے نفرت کرتا ہے۔ حکومت کو برا بھلا کہتا ہے۔ خود کچھ نہیں کرتا۔ مگر میں صرف سنتا ہوں۔ سننا اچھا ہوتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہاری ان موضوعات پر لوگوں سے بحث ہو چکی ہے۔''
بہت دیر بعد سیم کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔
''لوگ خود ہی اشتہار لگائے پھرتے ہیں اپنے نظریات کے۔ آپ کچھ نہ بھی بولیں تو بھی اپنا اندر باہر الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اپنے نظریات، پسند ناپسند سب پر بولتے ہیں اور بولتے بہت ہیں۔''

''اور؟''

''اور ہر جگہ لوگ ہی لوگ ہیں۔ گلی محلوں میں، سڑکوں پر، ہر جگہ کوئی نہ کوئی آدم نظر آ ہی جاتا ہے۔ اتنے زیادہ لوگ ہیں کہ میرا تو دم ہی گھٹنے لگتا ہے۔''
''تم تو منفی سوچوں میں کافی گھر چکے ہو''۔
''نہیں۔ تم ایشیائی اچھے لوگ ہو۔ کوئی اکیلا نہیں کھاتا' ساتھ والے کو بھی پوچھ لیتا ہے۔ دکھ درد بانٹ لیتے ہو۔ پھر قدرت نے جس خطے کو جو زیادہ دیا ہو وہی زیادہ بے گاتا۔''
دن ڈھلنے لگا تھا۔ سائے بڑھ گئے تھے۔ سورج آسمان کے کندھوں سے ایک مضمحل مسافر کے سر کی طرح ایک طرف ڈھلکنے لگا تھا۔ فضا میں کوؤں کا شور بڑھ گیا تھا۔ چند چیلیں بھی اور اوپر کہیں چکر لگانے لگی تھیں۔

ماحول میں فرحت آمیز آسودگی کی جگہ شام کے سایوں سے وابستہ یاسیت سرایت کرنے لگی تھی۔ سہ پہر اپنا پاکیزہ روشن لباس اتارنے اور شام کا ماتمی لبادہ اوڑھنے لگی تھی۔
''مجھے شامیں بہت خوفزدہ کرتی ہیں۔'' سیم نے خاموشی کو توڑا
''شاید اس لیے کہ یہ رات کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔'' میں نے لقمہ دیا۔
''نہیں۔ رات تو بہت خوبصورت چیز ہے۔ اعصاب کو بہت سکون دیتی ہے۔ ابدی حقیقت کا ایک لمحاتی رخ ہے۔''
میں نے اس کی بات کاٹ کر اُس کو چھیڑتے ہوئے کہا۔
''تمام برائیوں کی ماں۔''
''نہیں۔ برائی دن یا رات کی پرواہ نہیں کرتی۔ اور ہاں مجھے تم لوگوں کے تصور برائی

سے بھی بڑا شدید اختلاف ہے۔ ایک عورت برہنہ بازاروں میں نکل پڑے تو سراپا برائی اور مجذوب نکل پڑے تو ولی۔ انسان جانور کو ہلاک کر کے اس کا ماس کھا جائے تو جائز اور جانور انسان کو کاٹ کھائے تو درندہ۔ شہوت کی تسکین اگر سماج کی اجازت سے ہو جائے تو قبول، نہ ہو تو برائی۔'' وہ کافی دیر تک معاشرتی اور ثقافتی تضادات پر بولتا چلا گیا۔ مگر اب مجھے اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بھوک فلسفہ ہائے دور دراز پر غالب آنے لگی تھی۔

سیم سے کھانے کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ سبزی خور ہو چکا ہے۔ اسے شکوہ تھا کہ یہاں سبزی خور کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ سادہ سبزی یا تو ملتی نہیں یا پھر تیل میں لتھڑی ہوتی ہے۔

اب تک ہمیں باتیں کرتے بہت وقت بیت گیا تھا۔

میں نے اسے گیسٹ روم میں آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ لاؤنج میں آیا تو آرام کر کے، نہا دھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے تازہ دم نظر آ رہا تھا۔

میں اسے ایک مناسب ہوٹل میں لے گیا۔ دال اچھی بنی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب اس نے دودھ پتی مانگی تو مجھے ہنسی آ گئی۔

''تم تو کہتے تھے کہ تم نے اپنی خواہشیں محدود کر لی ہیں۔ پھر لگتا ہے کہ دودھ پتی کا نشہ لگ گیا ہے تمہیں۔''

''نشے سے خیال آیا عرفان یہاں پر چرس بہت بڑھیا ملتی ہے۔ شروع میں تو بہت مہنگی خریدتا رہا لیکن جب بعد میں پتہ چلا تو افسوس ہوا کہ ایسی شاندار اور پاک چیز میں بھی لوگ دھوکہ دینے سے باز نہیں آتے۔ یہ تو صوفیوں کے خاص استعمال کے لیے بنی ہے۔'' وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد میں نے بات جاری رکھنے کی غرض سے ایسے ہی بے معنی انداز میں پوچھ ڈالا۔

''سیم ایک طرف تم نروان کی تلاش میں نکلے ہو تو یہ بتاؤ کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے جو ہنوز تشنہ ہو؟'' میں نے گویا موضوع بدلا۔

''یہ خواہش کہ میری کوئی خواہش نہ ہو۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''یعنی موت۔ سکوت۔'' میں فوراً بولا۔

''نہیں۔ حیات انسانی کا نقطہ عروج۔ یہ وہ مقام ہے جہاں الوہی قوتوں اور انسان خاکی کا اتصال ہوتا ہے' اگر الوہی قوتیں ہوتی ہیں تو۔ میں اس رستے پر پورا چلنا بھی نہیں چاہتا۔ ولی تھوڑا ہوں۔ یہ سب کچھ مجھے Fascinate کرتا ہے۔ تھوڑی بہت کوشش کرتا ہوں۔ بہت لطف آتا ہے۔ اپنے سچے نظریات پر عمل کی کوشش اور اس میں کچھ کامیابی جنسی جذبے کی تکمیل کی آسودگی سے زیادہ اطمینان بخش ہے۔''

''یعنی میں تمہیں اس دور کا ہپی کہہ سکتا ہوں جس نے خواہشوں کو تج دیا ہے۔ ایک اچھا مادی مستقبل چھوڑا اور چرس کے کش لگا تا اس کرے پر گھومتا پھرتا ہے۔'' میں نے اسے چھیڑا۔

''ہپی نہیں درویش۔ ہپی ہونا ایک وقتی کیفیت ہے۔ تمہیں شائد یہ بھی پتہ نہ ہو کہ ماضی کے جتنے ہپی تھے ان میں سے بیشتر آج کامیاب مادی زندگی گزار رہے ہیں۔ کوئی بینکار ہے تو کوئی کاروبار میں ہے' مگر درویشوں کے تو انداز ہی نرالے ہوتے ہیں' وقت بدلتا ہے' بلکہ وقت تو کبھی بھی نہیں بدلتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقت گزرتا ہے' مگر وقت تو گزرتا بھی نہیں۔ وقت تو ایک آفاقی قوت ہے۔ یعنی۔۔۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ درویش بدلتا ہی نہیں اپنی موج مستی میں گم بھبھوت رمائے زمین کے سینے پر لڑھکتا رہتا ہے۔ مجھے تم ہندوستانیوں کا ایک اور صوفی سادھو ملنگ بہت Facinate کرتا ہے۔''

''وہ کون؟''

''وہ ہے گورو نانک۔ کیا شاندار بندہ تھا۔ کیا thrilling رونگٹے کھڑے کر دینے والی شخصیت تھی۔ واہ۔'' سیم کی نظریں دور کسی خیالی نقطے پر مرکوز تھیں۔

اس پر میں بول اٹھا'' کیا تمہیں پتہ ہے کہ ان کا آخر کیا ہوا تھا۔ شنید ہے کہ جب وہ پرلوک سدھارے تو مسلمانوں اور ہندوؤں میں جھگڑا پڑ گیا۔ مسلمان کہتے تھے کہ ان کو دفنانا ہے

اور ہندو جلانا چاہتے تھے۔ ابھی یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ ان کا جسد خاکی جہاں پر پڑا تھا وہاں سے غائب ہو گیا۔ وہ مقام آج بھی نارووال میں موجود ہے اور مرجع خلائق ہے' سکھ یاتریوں کی پاک جائے زیارت ہے۔''

''میں وہ جگہ دیکھنا چاہوں گا۔'' وہ فور جذبات میں بے ساختہ بول اٹھا۔

''ہاں لے چلوں گا۔ قریب ہی ہے۔''

اتنی دیر میں چائے ختم ہو چکی تھی اور ہوٹل کے بیرے، ہمارے اس میز سے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

ہوٹل سے نکل کر ہم کافی دیر قریبی بازار میں گھومتے رہے۔ وہ بہت دلچسپی سے دکانوں کو اور ان میں بھرے سامان کو دیکھتا تھا۔ چلتے چلتے ہم خواتین کے سامان کے ایک بازار میں داخل ہو گئے۔ پراندے، چٹکیاں، گوٹہ اور رنگ برنگے طرح طرح کے کپڑوں سے دکانیں لدی ہوئی تھیں۔

تنگ گلی تھی، سو کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ وہ بول اٹھا۔

''ایسی دکانیں اور بازار امریکہ میں نہیں ہوتے۔ یہ تو ایسے ہے جیسے ہر دکان کی اپنی منفرد شخصیت ہو۔ کتنے رنگوں اور خوشبوؤں سے بھرا بازار ہے۔''

سامنے ایک کڑاہے میں جلیبی تیار ہو رہی تھی تو ساتھ میں پکوڑے تلے جا رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر گلی ایک کھلے سے چوک میں جا ملتی تھی۔ ایک پھل والا شاید اپنی دکان بڑھا رہا تھا اس لیے جو پھل جس بھاؤ بکتا تھا بیچ رہا تھا۔

''یہ سب ہے تو بہت رنگا رنگ مگر صفائی۔۔۔ خیر ہر تہذیب کی ترقی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں اور ان کے لوازمات بھی متنوع ہوتے ہیں۔ شائد ایک وقت آئے کہ تمہاری تہذیب بھی ہماری تہذیب کی طرح ہو جائے۔ صاف ستھری پلاسٹک کی سی مصنوعی لیکن پر آسائش۔''

وہ نیم دلی سے ہنسا۔

''عرفان تمہارے ملک کی لڑکیاں خوبصورت ہیں مگر بہت جلد عورت ہو جاتی ہیں۔ ان میں نسوانیت کی وہ خوشبو اور نسائیت کا وہ رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جس سے ہماری عورتیں بہت حد

تک محروم ہو چکی ہیں۔ لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے کہ تم عورت ہو یا مرد۔ اور ویسے اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم زندہ ہو یا مردہ۔ لوگ مرنے سے بہت ڈرتے ہیں لمبی لمبی عمریں چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس دھرتی سے روز زندوں کی ایک نئی فصل پھوٹتی ہے اور مردوں کا ایک دریا ابد کے سمندر میں جا غرق ہوتا ہے۔ چکر در چکر ہے' سو چل رہا ہے' کوئی مرد ہے کوئی عورت' کوئی زندہ ہے کوئی مردہ۔ سب ایک ہیں سب ایک ہیں۔'' وہ ایک تھڑے پر بیٹھتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔

مجھے لحظے بھر کے لئے اس کے ذہنی توازن کے کھو جانے کا شک سا ہوا۔ پھر اس کا نارمل چہرہ دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا۔

''سیم کیا عورت کی خواہش نہیں ہوتی؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت کم۔ پھر اپنی ضرورت خود ہی پوری ہو جاتی ہے۔''

''عورت کو سمجھ سکے؟''

''سطحیت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ پیار بھی زیادہ ہوتا ہے اور جذبات بھی بھرپور۔ اسی لیے تو ہسٹریا کا شکار ہوتی ہے۔ اور ڈپریشن بھی زیادہ ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر ایک سڑیل مخلوق ہے۔ ناراض ناراض سی۔ اور ہاں نرگسیت بھی بہت ہوتی ہے۔ نہ یقین آئے تو کسی بھی عورت کی تعریف کر کے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھو۔ لیکن تعریف کرنے والے کی مہارت پر بہت دارومدار ہے۔''

''اور مرد؟''

''اوہ۔ مرد زیادہ خوبصورت ہے' مکمل ہے' دیوتا کا روپ ہے' کیا متناسب جسم ہے۔ عورت کیا ہے؟ نامکمل۔ جیسے کسی امتحانی پرچے میں پوچھا گیا نامکمل جملہ۔ کبھی کوئی بوڑھی عورت دیکھی ہے۔ اس کا ڈھلکا بدن اور لٹکتے اعضاء۔ مرد تو بڑھاپے میں اور بھی شاندار ہو جاتا ہے۔''

''لگتا تو ایسے ہے کہ اب بقیہ عمر عورت کے بغیر گزارنے کا ارادہ ہے۔ اتنے عورت دشمن پہلے تو کبھی بھی نہ تھے۔''

''عورت دشمن نہیں۔ عورت شناس۔''

''مرد کو غیر ضروری اہمیت نہیں دے رہے؟''

''یہ تو قدرت سے پوچھو جس نے سب بڑائیاں مرد کو دیں۔ بہر حال اس میں خامیاں بھی بہت ہیں۔ عورت سے زیادہ بیوقوف ہے۔ زیادہ حساس ہے۔ جذباتی اور حساس میں فرق رکھنا۔ اس لیے عورت سے کم عمر پاتا ہے۔ زیادہ زور سر کے بجائے ٹانگوں کے درمیان میں رکھتا ہے۔'' یہ کہہ کر سیم نے قہقہہ لگایا۔ پہلا قہقہہ بلکہ پہلا کھوکھلا قہقہہ۔ پھر بات جاری رکھی۔

''مذاق برطرف۔ سب ایک ہیں۔ عورت ہو یا مرد۔ ایک پودے پر اگنے والے دو مختلف پھول۔ آسمان سے برسنے والی بارش کی دو مختلف بوندیں۔ ایک سورج ہے' گرماتا ہے' دوسری چاندنی ہے' ٹھنڈک دیتی ہے۔ دونوں نہ ہوں تو نظامِ ہستی میں توازن نہ رہے۔''

میں نے ایک دم سوال دہرایا' جیسے ہم بہت سے سوال بے وجہ دہراتے رہے ہیں۔

''شمل یاد آتی ہے؟''

سیم خاموش ہو گیا۔ بہت دیر خاموش رہا۔

''ہاں۔''

''کتنی؟''

''بہت زیادہ۔ بہت عورتیں ملیں لیکن وہ سب سے منفرد تھی۔ کوئی خاص بات تھی اس میں۔ عزت نفس تھی اور پیار بھی تھا۔ سراپا ایثار و خلوص تھی۔ وہ جس طرح سے مجھے اور میرے جسم کو ٹوٹ کر پیار کرتی تھی اس سے پہلے کسی نے کیا اور نہ ہی بعد میں کوئی کر سکی۔ بس میری قسمت میں اس کے ساتھ رہنا نہ تھا۔ پھر میرا تو یقین ہے کہ جتنا بھی بڑا جذباتی حادثہ ہو جائے اور جب بھی ہو جائے اس سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ جینا تو آپ کو ہر حال میں ہے ہی۔ سوئی زندگی کا آغاز کرو اور سامنے دیکھو۔ چلتے رہو۔ Keep on walking۔''

سیم نے بات گول کر دی تھی۔ میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

اب رات گہری ہو رہی تھی۔ ہم گھر واپس لوٹ آئے۔

سیم تھکا ٹوٹا تھا سو آتے ہی سو گیا۔

اگلی صبح جب سورج کی کرنوں نے مجھے بیدار کیا تو سیم باغیچے میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک دلچسپ منظر تھا۔ سورج کی روشنی گھنے درخت کی شاخوں میں سے ایک موٹی شعاع کی صورت میں اس پر اس طرح پڑ رہی تھی اور اس کے گرد ایک پرنور ہالہ بنا رہی تھی جیسے اندھیرے سٹیج پر ناچتی روسی بیلے رینا پر روشنی ایک دھار کی صورت میں پڑتی ہو اور اس کو مرکز نگاہ بناتی ہو۔ اس نے ہاتھ میں کچھ پکڑ رکھا تھا اور اسے انہاک سے تک رہا تھا۔

میں جب چلتا ہوا اس کے قریب آیا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں چڑیا کا ایک بچہ (بوٹا) تھا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف کھسک گیا اور انتہائی احتیاط سے چڑیا کے بچے کو درخت کے پتوں کے گھونسلا نما حصار میں رکھ دیا۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ خاموشی کی برف کو پرندوں کی چہچہاہٹ کی گرماہٹ پگھلاتی رہی۔ یہاں تک کہ خاموشی مکمل طور پر پگھل گئی۔

"کتنی خاموشی ہے۔" میں بولا۔

"شروع شروع میں لگتی ہے۔ جب انسان ماحول کا حصہ بن جائے تو یہ خاموشی اور سناٹا ختم ہو جاتا ہے۔ قدرت انسان سے ہمکلام ہو جاتی ہے۔ پھر ہر طرف بولیاں ہی بولیاں اور باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں۔ درخت آپ سے باتیں کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ درخت میرے سے باتیں کرر ہا تھا۔ اس بچے کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ شائد اوپر کہیں چڑیا کا گھونسلا ہوگا۔ صبح تیز ہوا چلی تھی۔ اڑ گیا ہوگا۔ میں آیا تو بس یہ بیچارہ پڑا تھا۔ تمہارے درخت نے مجھے تاکید کی ہے کہ اس کا خاص خیال رکھو۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔

"بھلا درخت بھی باتیں کرتے ہیں۔ ہمارا ایک شاعر تھا۔ ناصر کاظمی۔ وہ بھی کہا کرتا تھا کہ درخت اس سے باتیں کرتے ہیں۔"

سیم کے چہرے کی نرم گرماہٹ یکدم منجمد ہو کر رہ گئی۔ اس کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"عرفان یہ درخت بوٹے پرندے اور جانور ہم سب سے بہت بہتر ہیں۔ سب کی اپنی

اپنی شخصیت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ان کی باتیں سمجھ نہیں سکتے۔ اگر سائنسی انداز میں بات کروں تو اس طرح کہوں گا کہ یہ درخت بوٹے سب جاندار ہیں۔ یہ سب خلیوں سے بنے ہیں۔ اور ہر خلیے کی اپنی یادداشت ہوتی ہے جو اس خلیے میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ گئے موسموں کا حال اور یہاں بیٹھنے والے لوگوں کی باتیں سب ان میں محفوظ ہوتی ہیں۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ ہم دونوں اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں لیکن ایک دوسرے کی زبان کو سمجھتے نہیں۔ ہمارے درمیان بس ایک لطیف سا فرق ہے''۔

پھر وہ کھوئے کھوئے انداز میں مسکرایا ''ارے بھئی عرفان میں نے تو تمہارے ملک کے کھنڈرات کی اینٹوں سے اچھی خاصی دوستی کر لی تھی۔ وہ مجھے بہت کچھ سناتی تھیں۔ ان کی اپنی یادداشت تھی۔ ذرا محبت کرو۔ انہیں سمجھو تو اپنا سب کچھ اگل دیتے ہیں یہ کھنڈرات۔ کھنڈرات میں بیٹھ کر سرسراتی ہواؤں میں ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں میں بیٹھ کر میں نے تخت بھائی کے خرابات سے بہت قصے سنے ہیں۔ وینس کی ایک کشتی نے مجھے ایک روز اپنے دل کا حال سنایا تھا۔ اجنتا کے غاروں کے پاس تو بہت قدیم قصے ہیں۔ راجستھان کے محلات رنگین کہانیوں سے لبریز ہیں۔ برازیل کے دلدلی جنگلوں میں سے ایک جنگل میں ایک خاص پودا اُگتا ہے۔ بالکل قد آدم ہوتا ہے۔ اس پر نارنجی رنگ کے پھول لگتے ہیں۔ شمالی برازیل کے ایسے ہی ایک جنگل میں لگے پودے پر اگے پھول سے میری بہت دوستی ہو گئی تھی۔ پھر میں نے اسے Adopt کر لیا۔ اب وہ میرے ساتھ ساتھ برفیلی چوٹیوں کی سیر کرتا ہے۔ تیز ہواؤں میں میرے ہمراہ لہراتا پھرتا ہے اور پھر میرے ہی ساتھ تھک ہار کر ایسے ہی کسی درخت کے قدموں میں گر پڑتا ہے۔ ہم دونوں آزاد ہیں اور ساتھ ہیں۔ ہم ہوا میں ہوا ہیں۔ پانی میں پانی، آگ میں آگ ہیں اور مٹی میں مٹی ہو جائیں گے''۔

''سیم یا تو تم صوفی ہو یا اپنے حواس کھو بیٹھے ہو۔'' مجھے اس پر باقاعدہ رحم آ رہا تھا۔

یہ سن کر سیم کے چہرے پر ایک پراعتماد مسکراہٹ ابھری۔ وہ اٹھا اور اپنی پتلون کی پچھلی جیب سے بٹوہ نکال کر خالی کر دیا۔ کچھ کرنسی نوٹ تھے۔ ایک بوسیدہ پھیکے رنگوں والا بکھرا بکھرا سا نارنجی پھول تھا اور ایک تصویر تھی۔ گرینڈ پا کی تصویر۔

''عرفان اب میں اپنے بٹوے میں لوگوں کے پتوں اور فون نمبروں والی ڈائری نہیں رکھتا۔تمہارے گھر بھی کچھ یادداشت کے زور پر، کچھ پرانے دوستوں سے پوچھتے پچھاتے اور کچھ اتفاقاً آ پہنچا ہوں۔ یہ ایڈریس اور فون نمبر میرا رستہ روکتے ہیں' مجھے پیچھے کو کھینچتے ہیں۔میرے پاس اپنی کھونٹیاں ہیں جن سے یادوں کے گھوڑے باندھے جاتے ہیں۔میرا اتنا بڑا اصطبل ہے کہ مجھے یقین ہے کہ جب میں بڑی حقیقت میں گم ہو جاؤں گا تو بہت امیر رخصت ہوؤں گا۔''

''مجھے کبھی تمہاری بالکل سمجھ نہیں آتی۔''میں نے الجھے لہجے میں اسے کہا۔

''ڈیوڈ کو جانتے ہو؟''اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

''نہیں۔''

''ڈیوڈ امریکہ میں میرے گھر کے سامنے واقع پارک کا سب سے مخلص درخت تھا۔ جب میں وہاں سے آیا تھا تو پہلے اکثر اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی پر بیٹھ کر اسے دیکھا کرتا تھا اور اس سے باتیں کیا کرتا تھا۔میں جب جہاں گردی پر نکلا تو میرا واحد ہمدرد دوست وہی تھا اور میری کمی کو بھی سب سے زیادہ وہی محسوس کرتا ہوگا۔''

میرے ذہن میں سوال تھا''سیم ڈیوڈ اس کی نسل تھی یا اس کا حیاتیاتی نام؟''

''ارے نہیں بھئی۔یہ نام تو میں نے اسے دیا تھا۔میرے تمام دوست درختوں کی اپنی شخصیتیں اور نام ہیں۔''

''پھر میرے اس درخت کا بھی کوئی نام ہے؟''میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں' اسلم نام ہے اس کا۔کل ہی رکھ دیا تھا۔''اس نے فوراً جواب دیا۔

''یہ اسلم نام تمہارے ذہن میں کیسے آیا؟''میں نے مسکراتے ہوئے سوال داغا۔

''تمہارے ایک مہربان دیہاتی کا نام ہے جس نے مجھے اپنے گھر میں دو روز کے لیے ٹھہرایا تھا۔''اس نے کندھے موڑتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسا لگا تمہیں اس کے گھر ٹھہرنا؟''میں نے پوچھا۔

''قدرت کے بہت نزدیک رہتے ہیں تمہارے دیہاتی لوگ' بالکل نیچرل۔مویشیوں کے بیچ میں اور فصلوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔البتہ ایک چیز سے مجھے بہت اختلاف ہے

اور وہ یہ کہ صفائی کا خیال نہیں رکھتے۔ جانور کے بیچ میں انسان کو جانور نہیں بن جانا چاہیے۔ کچھ ان کی سطح سے اٹھ کر سوچنا چاہیے۔ اب دیکھو نا کہ تمہارے دیہات میں غلاظت کی نکاسی کا کوئی مناسب انتظام نہیں اور پھر یہ سب جوہڑوں کی صورت میں دیہات کے پہلو میں اکٹھا ہو کر فضا کو متعفن کرتا رہتا ہے۔ لیکن ان سب خامیوں کے باوجود یہاں کا انسان قدرت کی گود میں بیٹھ کر اس کی دلنشیں لوریاں سنتا ہے اور یقین جانو کہ مادرِ قدرت کی لوریوں میں وہ تسکین اور آسودگی ہے جو کسی بھی آدم ساختہ ساز میں نہیں۔ اس میں وہ غنائیت اور موسیقیت ہے جس پر آسمانوں کے فرشتے بھی وجد میں آ جاتے ہوں گے۔ یہ دیویوں کے آسمانوں پر چلنے سے پیدا ہونے والی گھنگھروؤں کی چھنچھناتی موسیقی سے زیادہ دلنشیں ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے جنم لینے والی نغمگی سے زیادہ دل پذیر ہے۔ یہ الوہی سُر ہیں جو دل کی تاروں پر چھیڑے جاتے ہیں۔'' سیم باقاعدہ وجد میں آ رہا تھا۔

''اچھا تو تمہیں موسیقی کا اب تک شوق ہے'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکے اور وہ گویا ہوا۔

''ہاں مجھے موسیقی بہت پسند ہے۔ مگر ایک موسیقی قدرت کے سازوں پر، تخلیق کے ڈھول پر فنا کی چوٹ ہے۔ اور وہ ہے اجڑتے، کھنڈر ہوتے گھر کی ڈیوڑھیوں میں سنسناتی چیختی سیٹیاں بجاتی آندھی میں بدلتی جھکڑ ہوا کے نوحے، کواڑوں کے زور زور سے بجنے سے پیدا ہونے والی دھمک۔ یہ حزنیہ والمیہ موسیقی اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور یہ کہ جو کچھ ہے وہ بھی نہیں ہے۔ فنا کے اس سر پر ایک تال بھی ہے اور وہ ہے مرن گھاٹ پر جلتے مردے کی ہڈیوں کے چٹخنے کی تال۔ کہاں وہ سر تال ہے اور کہاں یہ پاتال۔ کہاں وہ الوہیت کے دوہے ہیں اور کہاں یہ فنا کے نوحے۔ کہاں وہ تخلیق کار وجد میں آن کر حال و قال کرتا ہے اور کہاں یہ تخریب کار جوش وجنوں میں ساز فنا پر دھمال کرتا ہے۔ وہ ہست ہے یہ نابود۔ یہ سب ایک خدا نہیں ہو سکتا۔ وہ یا تو خالق ہے یا مختتم۔ ایک رب کے دو چہرے نہیں ہو سکتے۔ یہ دو ہی ہیں۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے۔ باہم دست و گریباں۔ کبھی ایک حاوی تو کبھی دوسرا بھاری۔ یقیناً دو خدا ہی

ہوتے ہوں گے.............زرتشت کیا خوب آدمی تھا۔"

یہ سن کر میں احتجاجی لہجے میں بول اٹھا۔

"سیم اپنا تو خانہ خراب کر ہی بیٹھے ہو۔ مجھے تو خراب نہ کرو۔"

سیم معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"سب پتہ چل جائے گا۔"

"کیا پتہ چل جائے گا؟"

"یہی کہ جو کچھ سوچا تھا وہ نہیں نکلا۔"

"ایک تو تم پہیلیوں میں بات کرتے ہو۔"

"اس کرے پر وجود وافزائش حیات بذات خود ایک معمہ ہے۔ ہم بڑا ناز کرتے ہیں کہ ہمیں آنے والے وقت کی خبر دی گئی ہے۔ مگر خبر دینے والا کوئی کبھی خود لوٹ کے اپنی خبر دینے نہیں آیا۔"

"خوابوں میں آیا کرتے ہیں۔"

اس پر سیم کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

"ہاں خوابوں کو تو میں خود بھی مانتا ہوں۔ گرینڈ پا کئی مرتبہ میرے خواب میں آئے ہیں۔ تمہاری بات میں صداقت ہے اور یہ دل کو لگتی ہے۔ اس پہلو سے تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔"

اب ہمیں بات کرتے کافی وقت ہو چلا تھا۔ بے ربط باتیں اور بے سمت سوچیں۔ دونوں تھک چلے تھے۔ ہوا رک گئی تھی اور ماحول میں گھٹن گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے سیم سے کہا۔

"کم از کم لاہور کو ایک زندہ شہر تو کہا ہی جاتا ہے' مگر اس میں کوئی خاص اعلیٰ درجے کے تھیٹر، میوزیم، لائبریریاں، سیمینار ہال، اوپیرا ہاؤس وغیرہ تو نہیں جن کی تمہیں عادت ہوگی۔ ہاں ہوٹل اچھے ہیں۔ اعلیٰ کھانا ملتا ہے۔ اور پھر تمہارے لیے اعلیٰ پکی ہوئی یا پھر ابلی ہوئی سبزی بھی ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔"

میرے نیم معذرت خواہانہ رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولا "یہ سب بہت زیادہ دیکھ چکھ لیا ہے۔ اس میں کچھ زیادہ نہیں ہے۔ تم کتنے دن تھیٹرز میں جا کر اچھا کھیل دیکھ سکتے ہو۔ کتنے میوزیم تمہاری دلچسپی برقرار رکھ سکتے ہیں اور کتنے بھی سیمناروں سے ہو آؤ، زندگی کی کم مائیگی اور قدرت کی قوت، عالمگیر قدرت کی بے اندازہ طاقت کا ادراک تمہارے ذہن سے محو نہیں ہوسکتا۔"

بہرحال سیم کو کھینچ کھانچ کر میں گھر سے باہر لے گیا۔

میرا ارادہ تھا کہ اسے کوئی انگریزی فلم دکھائی جائے۔ لیکن وہ کوئی پاکستانی فلم دیکھنا چاہتا تھا۔ زبان کے حوالے سے اس کا خبطی نظریہ تھا کہ وہ ہر زبان کچھ کچھ سمجھ لیتا ہے۔ پھر میرا ارادہ اچھا سا کھانا کھلا کر اسے اندرون شہر کی پرانی رنگین ثقافت دکھانے کا تھا۔ جب یہ سارا پروگرام میں نے اس کے سامنے رکھا تو وہ فوراً مان گیا۔

پاکستانی فلم اس نے بہت شوق سے دیکھی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ وقفے سے پہلے اٹھ آئے گا مگر وہ آخیر تک بیٹھا رہا۔ فلم دیکھ کر جب ہم ہال سے باہر آئے تو وہ بول پڑا۔

"بہت اچھی فلم تھی۔"

میں بے ساختہ بول پڑا۔

"سیم تمہارے ذوق کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ بلند آہنگ گانے، رنگین لاچے، دیہات کا مصنوعی ماحول اور جعلی ساعشق اور آنکھ مٹکا' یہ تو بہت سطحی چیزیں ہیں۔"

وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"یاد رکھنا جو معاشرہ جتنا پسا ہوا اور دبا ہوتا ہے وہاں پر ایسی تخیلاتی فلموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک فرار ہے۔ ایک سیفٹی والو ہے۔ یہاں لوگوں کی زندگیوں میں بھلا المیوں اور آزمائشوں کی کوئی کمی ہوتی ہے جو وہ سینما گھر میں آ کر حقیقی فلمیں دیکھیں۔ یہ فلمیں تھوڑی دیر کے لیے انہیں حقیقت سے دور لے جاتی ہیں۔ وہ ہنس کھیل لیتے ہیں۔ یہ ایک بندر تماشا ہے۔ تماشائی

ڈگڈگی بجا رہا ہے اور بندر ناچ رہا ہے۔''

''ایک تو تم ہر شے میں فلسفہ لے آتے ہو۔ بہر حال میری زندگی میں بھی الیے کم نہیں لیکن مجھے ایسی بے معنی فلمیں قطعاً پسند نہیں۔ یہ زندگی کا ایک بہت سطحی رخ سامنے لے کر آتی ہیں۔ مزاح معیاری بھی ہو سکتا ہے۔''میں نے جھنجھلا کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

وہ بولا'' کیا معیاری ہے اور کیا غیر معیاری یہ سب ایک تقابلی بات ہے۔ جو تمہارے نزدیک معیاری ہے وہ کسی دوسرے کے نزدیک غیر معیاری ہو سکتا ہے۔ پھر میں تو جیو اور جینے دو کے اصول کا پیرو ہوں۔ جو کام جسے پسند ہے وہ ضرور کرے مگر تب تک جب تک کسی کو اس سے کوئی گزند نہ پہنچے اور جب تک وہ معاشرتی تخریب کا باعث نہ بنے۔ مگر یہ بھی ایک تقابلی شے ہے۔ معاشرہ تو ہر وقت تخریب و تعمیر کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ یہ کوئی جامد و ساکن شے تو نہیں۔ یہ تو ہر وقت متغیر ہے۔ ہر لحہ سیال ہے۔ ہر ثانیہ تبدل کا شکار۔ بیرونی اور اندرونی عناصر کو دعوت اثر دیتا۔ ہر عنصر وقت کی طرح موجود بھی اور غائب بھی۔''

''بہر حال ایک مرکب تو ہے۔ اور اس مرکب کا ایک چہرہ بھی ہے۔ یہ مسکراتا بھی ہے اور حزن والم کی تصویر بھی بن جاتا ہے۔ یہ شکم سیر بھی ہے اور بھوکا بھی۔''میں نے جواز پیش کیا۔

''ہاں کچھ حد تک تمہاری بات درست تو ہے۔''اس نے میرے خیال کی تائید کی۔ گفتگو بھی بہت بوجھل ہو چکی تھی۔

میں چاہتا تھا کہ ہم کچھ ہلکا پھلکا ہو لیں۔

اس کا موقع سیم نے خود ہی پیش کر دیا۔ کھانا کھا کر شہر گردی کرتے ہوئے جب ہم داتا صاحب کے مزار کے قریب پہنچے تو سیم کو میں نے داتا صاحب کی شخصیت اور ذات کا بتایا۔ اس پر اس نے وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ابھی ہم مزار کے قریب ہی تھے کہ ایک تانگہ سامنے سے گزرا۔ تانگہ ہر طرف سے اشتہاری بورڈوں سے سجا ہوا تھا۔ یہ اشتہاری بورڈ ایک سرکس کے تھے۔ یہ دیکھ کر سیم مچل اٹھا اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگا کہ وہ سرکس دیکھے گا۔ خیر ہم نے داتا صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھی' سیم بھی ہاتھ اٹھا کر کچھ سرگوشیاں سی کرتا رہا اور لمبے سانس بھرتا رہا۔ پھر اس نے سرکس کی جانب لپکنے کی کی۔

ایک بڑے پنڈال میں سرکس لگی ہوئی تھی۔ ہر طرف ہجوم خلقت تھا۔سروں کی فصل تھی اوراس پرآوازوں کااناج اُگتا تھا۔سیم میرے کان کے قریب منہ لاکرزور سے بولا۔

''کبھی گفتگو کے وقت بولنے والے کے تاثرات اوراشاروں کودیکھا کرو۔ بہت مضحکہ خیزلگتا ہے۔ ہماری ساری توجہ باتوں کی طرف منعطف ہو جاتی ہےاس لیےہم بولنے والے کے چہرےاوراعضاء کی حرکات کی طرف توجہ نہیں کر پاتے۔کبھی اپنے کانوں کو بند کر کےصرف بولنے والے کی حرکات وسکنات کودیکھوتو عجب تماشالگتا ہے۔''

یہ کہہ کراس نے ایک زوردار قہقہہ لگایااور سامنے بیٹھے ایک طوطے سے فال نکالنے والےاوراس کےطوطےکوبڑی دلچسپی سے دیکھنےلگا۔

طوطےکودیکھتے دیکھتے سیم نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''میں جانوروں اور پرندوں سے رابطہ کرلیتا ہوں۔اس طوطے کی آنکھوں میں میں نے اپنے لئے اپنائیت پڑھ لی ہےمگراس کے مالک کی آنکھوں میں ایک خاص حقارت ہے''۔

سیم نےتھوک نگلااور بولا۔

''تمہارے ملک میں یاتو میں نےلوگوں کی آنکھوں میں اپنے لئے مرعوبیت اورمحبت دیکھی ہے یاپھرحقارت۔بیچ کا کوئی جذبہ نہیں۔میں جانتاہوں کہ اس میں میری رنگت اورقومیت کا خاص دخل ہے پر میں گلی گلی گھوم کرتمہارے ہاں کے انسانوں کو بتادونگا کہ میرے ملک میں بھی اچھےانسان کم نہیں''۔

پہلےتواس نےشرارت سےمیری طرف دیکھااورپھراس کی آنکھوں میں نمی تیرگئی۔

''خواہ اس کے لئے مجھے بندر کی طرح ناچنا ہی کیوں نہ پڑے۔تمہارے ہاں کے انسان میری بات پرضروریقین کرلیں گے''۔

کبھی کبھی مجھے سیم پرایک ننھے منے بچے کا گمان ہوتا جوابھی پنگھوڑے میں انگوٹھا چوستے چوستے تالیاں پیٹنے لگےگااورقلقاریاں مارنے لگےگا۔اورکبھی ایک بدھ بھکشوکا شبہ ہوتا جو

من کی وادی میں اتر کر معرفت کی تلاش میں ہوتا کہ اپنی تشنہ رُوح کو سیراب کر سکے۔ جو بظاہر دیوانہ ہو مگر درحقیقت فرزانہ ہو۔ جو خطرات سے مجامعت کو تیار بیٹھا ہوتا کہ ان کے بطن سے جنم لینے والی تلخ صداقتوں کو گود میں لے سکے۔ جو جانتا ہو کہ تمام سچائیوں کا رخ موت کی طرف ہے جو تخلیق وحیات کے بعد سب سے بڑی سچائی ہے۔

یہ کچھ ملنگ قلندر سا، کچھ سنکی سا سیم میرا دوست سیم۔

وہی سیم جو اس روز سرکس میں جانوروں کے کرتب اور طوطے کو فال نکالتا دیکھ کر خوشی سے بے حال ہو رہا تھا اور جب ہم باہر نکلے تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

ہنستے ہنستے وہ رونے لگا تھا۔

پھر روتے روتے چپ ہو گیا تھا۔

اتنے چپ ہو گئی۔

اس نے بولنا چھوڑ دیا۔

پورا ایک دن وہ چپ رہا۔

مجھے ڈر لگنے لگا۔

ایک احساس سا ہوا کہ اب کچھ ہونے والا ہے۔

مگر کچھ نہ ہوا۔

ہوا تو صرف اتنا کہ اس سے اگلی صبح جب سورج کی کرنوں نے میرے شعور پر دستک دی اور میں تحت الشعور اور لاشعور کے گورکھ دھندے سے بیدار ہوا اور اس کے کمرے میں گیا تو وہ جا چکا تھا۔

اپنے خبط سمیت جا چکا تھا۔

سیم ہی نے تو ایک مرتبہ کہا تھا کہ زندگی میں چلتے چلتے یونہی تمہاری ملاقات اتفاقات سے ہو ہی جاتی ہے۔ پھر اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ وہ گلی گلی بندر کی طرح ناچ کر میرے ہاں کے انسانوں کے دل جیت لے گا اور وعدہ کیا تھا کہ واپس مجھے اپنی کامیابی کی خبر سنانے ضرور لوٹے گا۔ اُس نے چپ لگنے سے پہلے شورش زدہ پہاڑی علاقوں کی طرف جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

شائد وہ اُدھر ہی کو گیا ہوگا۔ پھر وعدے کے باوجود نہ جانے واپس کیوں نہ لوٹا؟ جب مجھے کئی مرتبہ اندیشے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں تو میں دل سے اپنے معصوم دوست کے لیے دعا کرتا ہوں۔

اب تک یاد کی لَو دھیمی پڑ چکی تھی۔

نیچے شاہراہ سے جلوس گزر گیا تھا اور ٹریفک بحال ہو گیا تھا۔

میں نے کھڑکی بند کر دی اور قریبی صوفے پر ڈھے کر آنکھیں موند لیں۔

اور نارنجی پھول کی مخصوص بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔

☆......☆......☆

email: irfanjaved1001@gmail.com

عرفان جاوید لاہور میں پیدا ہوئے اور گورنمنٹ کالج، لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ نوے کی دہائی میں ''فنون'' (مدیر: احمد ... سے لکھنے کا آغاز کیا جس میں ان کے باقاعدگی سے افسا... شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ ان کی تخلیقات ''معاصر'' ... قاسمی)، ''دنیازاد'' (آصف فرخی)، ''سمبل'' (علی محمد فرشی)... (قاسم یعقوب)، ''ماہِ نو'' (حکومت پاکستان) اور ''ماہ... (امجد رؤف خان) وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ عرفان جاوید کے مضامین انگریزی رسائل و جرائد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

میں عرفان سے پہلی بار کب ملا، یہ میرے جینز تک بھول چکے ہیں، شائد ہم پہلی بار طوفانِ نوحؑ کے بعد اس وقت ملے تھے جب فاختہ منہ میں زیتون کی شاخ لے کر کشتی میں واپس اتری تھی اور حضرت نوحؑ نے مسافروں کو طوفان تھمنے کی خوشخبری سنائی تھی یا ہم پہلی بار اس وقت ملے جب ارتقا میں پہیہ ایجاد ہو رہا تھا یا قدیم وقتوں کے انسان نے کھرپے کے پیچھے رکھ کر پہلی بار ہل جوتا تھا یا جب بنی اسرائیل نے عورتوں کے زیور پگھلا کر سونے کا بچھڑا بنایا اور اس کی پرستش شروع کر دی یا جب حضرت یوسفؑ کے بھائی انہیں کنوئیں میں چھوڑ کر چلے گئے تھے یا جب مصر کی بوڑھی مائی نے انی کے بدلے یوسفؑ کو خرید لیا تھا یا جب ابوالہول کا سر تراشا جا رہا تھا اور سورج اہراموں کی نوکیلی چھتوں پر پہنچ کر سہم جاتا تھا یا ہم اس وقت ملے تھے جب حضرت عمرؓ کا خط نیل کے پانیوں میں گھل رہا تھا اور وہ خط کی گھلتی سیاہی میں اپنی سرشت بدل رہا تھا یا پھر ہم ہڑپہ، موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کی گرتی ہوئی دیواروں کے سائے میں ملے تھے۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہاں کبھی کبھی اتنا یاد آتا ہے ہم دونوں نے اجنتا اور الورا کے غاروں میں سرکتی ہوئی لے اپنے کانوں سے سنی تھی اور اپودھیا کے جنگلوں میں لکشمن کی بانسری اور تبت کی گھاٹیوں سے اترتے بھکشوؤں کی ہلکی ہلکی ٹنک ٹنک اور ٹنک ٹنک سنی تھی اور شائد، شائد اور شائد ہم نے مریخ کی سیڑھیوں سے وینس کو آہستہ آہستہ زمین پر اترتے بھی دیکھا تھا اور شائد ہم نے چاہِ بابل کی اندھی دیواروں کے ساتھ لٹکے ہوئے فرشتوں کی توبہ بھی سنی تھی اور شائد ہم لوگ سکندر مقدونی کے لشکر کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے ساہیوال بھی پہنچے تھے۔ مجھے کبھی کبھی یہ یاد آتا ہے اور اس کے ساتھ ہی امرت کے چشموں کے ذائقے زبان کی نوک پر ناچنے لگتے ہیں، میرے اور اس کے درمیان کچھ ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ آگے بہتا جا رہا ہے اور زمانے کی کوئی رکاوٹ ہمارے درمیان حائل نہیں ہو رہی۔

ہم شائد کسی جنم میں ایک دوسرے کے باپ بیٹے، بھائی بھائی اور بیٹے اور باپ بھی رہے ہوں کیونکہ ہمارا تعلق، ہمارا رشتہ رسمی محسوس نہیں ہوتا اور آپ اتنے طویل تعلق اور اتنی لمبی راہ و رسم کے بعد بھی مجھ سے پوچھ رہے ہیں 'عرفان کیسا ہے، یہ کیسا لکھتا ہے اور اس کا آرٹ کب تک زندہ رہے گا' میں اس سوال پر ہنسنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں کیونکہ میں صدیوں پرانے کنوئیں کی وہ کائی ہوں جس کے ہوتے ہوئے کنوؤں کی عمر نہیں پوچھی جاتی اور میں برگد کے درخت کی وہ لٹ ہوں جسے دیکھنے کے بعد برگد کی تاریخ پیدائش جاننے کی ضرورت نہیں رہتی۔ عرفان میرے لیے بس عرفان ہے اور اس کے بعد 'کافی ہاؤس' سے لے کر شاخِ زیتون تک کہنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ بس وقت ...
اور عرفان اور میں زندگی کی ایک ہی لکیر ہیں۔ میں ...

www.sang-e-meel.com
ISBN-10 969-35-2414-4
ISBN-13 978-969-35-2414-7
9789693524147
www.sang-e-meel.net